بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بے گناہوں پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟

ذہن انسانی نے اپنے عجز کا مظاہرہ مختلف انداز سے کیا ہے۔ اس نے کبھی (عیسائیت کے عقیدہ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور اس کی پاداش میں دکھ جھیلتا ہے۔ کبھی (یونان سے برآمد شدہ اور ہندوؤں کے اپنائے ہوئے عقیدہ تناسخ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ کہیں اس نے (مجوسیوں کے تتبع میں اختیار کردہ مسلمانوں کے عقیدہ کے رو سے) یہ کہا کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر سے متعلق ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جن کا دل (مہاتما بدھ کی طرح) زیادہ رقیق تھا' انہوں نے اس قسم کے دو چار واقعات دیکھ کر خود دنیا سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ اگر ان کے دل جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے' حقائق کا بے نقاب سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتے تو اس بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ اس طرح ان کے سامنے یہ حقیقت آ جاتی ہے کہ فرد' معاشرہ کا جزو ہوتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ اس قسم کے افراد کے حالات۔ غلط معاشرہ میں بے گناہ افراد بڑے دکھ جھیلتے اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور اس معاشرہ کا مفاد پرست طبقہ انہیں ''گناہ اول'' ''تناسخ'' یا ''تقدیر'' کے عقیدوں میں الجھائے رکھتا ہے تاکہ ان کی نگاہ ان کی طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔ اگر انہیں بتا اور سمجھا دیا جائے کہ ان کی مصیبتیں اور تکلیفیں اسی معاشرہ کی پیدا کردہ ہیں تو وہ اٹھ کر اس معاشرہ کو زیروزبر کر دیں اور اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر دیں۔ غلط معاشرہ کا یہی وہ ''فتنہ'' ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے محتاط رہو کیونکہ اس کی خرابیاں انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جو ان کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس آگ کے شعلے دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہماری نگاہ ان تکلیفوں کی طرف تو جاتی ہے جو غلط معاشرہ میں ہمیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کے لئے ہم پکار اٹھتے ہیں کہ یہ سزا ہمیں کس جرم کی پاداش میں مل رہی ہے۔ لیکن معاشرہ کی طرف سے ہمیں جو

سہولتیں میسر ہوتی ہیں ان کے متعلق ہم کبھی نہیں سوچتے (اور کہتے) کہ ہم نے (انفرادی طور پر) وہ کون سے کارہائے نمایاں کئے ہیں جن کے صلہ میں ہمیں یہ سب آسانیاں میسر ہو رہی ہیں۔ (مثلاً) انگریزی طب کی کتابوں میں ایک تصویر دیکھنے میں آتی ہے کہ آج سے قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل کا زمانہ ہے۔ یونان کا ملک۔۔۔ ایک بادشاہ کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا ہے جس کے متعلق اطباء کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ بادشاہ کو فرش پر لٹا رکھا ہے اور چار پانچ دیوہیکل غلام اسے چاروں طرف سے دبائے ہوئے ہیں کہ وہ ہلنے نہ پائے۔ ایک ''سرجن'' آری سے اس کی ٹانگ کاٹ رہا ہے۔ ایک طرف کوئلے دہک رہے ہیں جن میں لوہے کی سلاخیں گرم ہو رہی ہیں۔ پاس ہی کڑاہی میں تیل اونٹھ رہا ہے۔ جب آری سے ٹانگ کٹتی ہے تو دوسرا طبیب اسے لوہے سے داغتا ہے اور اس پر گرم گرم تیل ڈالتا جاتا ہے تاکہ خون بند ہو جائے اور زخم جل کر سوکھ جائے۔ آپ سوچئے کہ اس عمل جراحی میں اس مریض (بادشاہ) پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس نے چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

اس سے اگلے ہی صفحہ پر دورِ حاضر کے ایک کلینک کی تصویر ہے جس میں سرجن نے مریض کو ایک ٹیکہ لگا کر بے حس کر دیا ہے اور نہایت اطمینان سے اس کا اپریشن کئے جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بادشاہ نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے اس قدر جانکاہ تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی تھی اور ہم نے کون سے ''اعمال صالحہ'' کئے ہیں جن کی جزا میں ہم اس قدر آرام اور راحت سے اپنا علاج کرا لیتے ہیں۔ یہ ہے معاشرہ میں افراد کی حالت کا نقشہ۔

یہ مثال طبعی احوال و کیفیات کی ہے۔ اسی سے تمدنی اور عمرانی احوال و کیفیات کا اندازہ لگا لیجئے۔ جب اور جہاں معاشرہ صحیح اقدار انسانیت کا حامل ہوگا' افراد کی زندگی سکون اور اطمینان سے گزرے گی۔ جب وہ غلط بنیادوں پر متشکل ہوگا' افراد مصیبتیں بھگتیں گے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کیا اور کہا کہ بے گناہ افراد کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ غلط معاشرہ کو صحیح معاشرہ میں تبدیل کیا جائے۔ معاشرہ کو غلط بنیادوں پر قائم رہنے دینا اور افراد کی مصیبتوں پر آنسو بہانا (یا خیر خیرات سے ان کی تکالیف کو دور کرنے یا ان میں کمی کرنے کی کوشش کرنا' حالانکہ اس سے ان کی طبعی تکالیف تو دور ہو سکتی ہیں لیکن ان کے شرف انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے' ایک قلب حساس کے نزدیک اس کی تکلیف' طبعی تکلیف سے کہیں زیادہ اور شدید ہوتی ہے) یا تو کمزوریٔ اعصاب کی دلیل ہے اور یا مفاد پرست گروہ کی فریب کاری کا مظہر جس کا آلہ کار مذہبی پیشوائیت بنتی اور مظلوموں کو غلط عقائد کی افیون پلا کر سلائے رکھتی ہے۔ ان مصیبتوں کا صحیح علاج غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ کی

تشکیل کے سوا کچھ نہیں۔

صحیح معاشرہ کا قیام وہ عمل صالحہ ہے جس کا خوش گوار اور حیات بخش ثمرہ تمام (موجودہ اور آنے والی نسلوں تک کے) افراد معاشرہ کو ملتا ہے اور غلط معاشرہ کو قائم کرنا یا اس کے قائم رکھنے میں مدد و معاون بننا (خواہ یہ معاونت بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ) وہ جرم ہے جس کی پاداش میں افراد معاشرہ اس قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے اور دکھ جھیلتے ہیں۔ غلط معاشرہ کو بدلنے والے افراد بھی اپنی ان کوششوں میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں، لیکن اس سے ان کی ذات کی ایسی نشو ونما ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں طبیعی تکالیف اور مصائب ہیچ نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا!!!!!!
حادثے مجھ پہ جو گزرے مِرے حالات میں تھے

۸۔اکتوبر۲۰۰۵ءکو پاکستان زلزلوں سے لرز اٹھا۔ اس دن سے لمحۂ موجود تک ''زلزلہ۔۔آفت یا عذاب؟'' کے عنوان سے مذاکرے اور مناظرے برابر جاری ہیں۔ اسی حوالے سے ہمارے ایک فاضل دوست نے بھی اردو کے نامی روزنامے میں اپنے نکات فکر سے قوم کو فیض یاب کیا ہے۔ آپ کا اندازِ نگارش بلاشبہ ادیبانہ ہوتا ہے' طرز استدلال بھی بظاہر عالمانہ اور یکسر منفرد ہوتا ہے لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب جدیدیت کے پردے میں رسمی اور روایتی باتیں ہی پیش کی جاتی ہیں۔ مولانا حالؔی نے کہا تھا: ''کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر۔۔تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر۔۔کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر۔۔نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر''۔۔ہماری گزارش بس اس قدر ہے کہ ''تونگر'' کی جگہ عصر حاضر کے ''دانشور'' کو رکھ لیا جائے تو غالباً بات زیادہ مؤثر ہو جائے گی۔

اس ضمن میں اس نکتے کا اعادہ ان دنوں بار بار ہوا ہے کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ اس عذاب کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا جو کسی قوم پر اجتماعی نافرمانی کی سزا کے طور پر آتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے آپ ﷺ اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد اس عذاب کی پیشگی شرائط کا پورا ہونا ممکن نہیں۔یعنی اب اتمام حجت ہوسکتا ہے نہ ہی ماننے والوں اور انکار کرنے والوں کو دو اور دو چار کی طرح الگ کیا جا سکتا ہے اس لئے اب اللہ کا وہ عذاب نازل نہیں ہوگا جس کی نوعیت کسی قوم کی اجتماعی نافرمانی کے لئے سزا کی ہے۔

صاحبو! اس نقطۂ نظر کے پیچھے درحقیقت ایک آیت ہے جس کی تفہیم کے سلسلہ میں ہمارے بعض فاضل احباب نے ٹھوکر کھائی ہے: قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا (۱۷/۱۵)۔

''ہم کسی بستی کو (اس طرح) تباہ نہیں کرتے کہ وہاں اپنا پیغامبر نہ بھیج دیں۔''

اچھا جناب! اس آیت سے استنباط یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان بستیوں کو تباہ کیا گیا جہاں رسول مبعوث ہوئے۔ یعنی اگر وہاں بالفرض رسول نہ آئے ہوتے تو وہ بستیاں تباہی و بربادی سے بچ جاتیں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے کہ انبیاء و رسل کو تو بھیجا ہی اس لئے جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو ہلاکت اور غارت ہونے سے بچائیں اور یہاں یہ سمجھا گیا کہ نبیوں اور رسولوں کی بعثت کے سبب قومیں عذابوں کا شکار ہوئیں۔ ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا' جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

یہ نہیں کہ ہم نے مذکورہ فضلاء سے یہ بات خواہ مخواہ منسوب کر دی ہے۔ آپ محولہ سطور کو از سرِ نو پڑھ لیجئے جن کو اوپر ہم نے بطور حوالہ Quote کیا ہے کہ ''آپ ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ اس عذاب کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا جو کسی قوم پر اجتماعی نافرمانی کی سزا کے طور پر آتا ہے۔۔۔'' مطلب یہ کہ اب آپ ﷺ چونکہ دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں لہٰذا قوموں کو کھلی چھٹی مل گئی ہے کہ جو چاہے گل کھلاؤ' کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔ ویسے اس تناظر میں ''ختم نبوت'' کی وہ معنویت بھی اجاگر ہو جاتی ہے جس کی تفہیم کا ہمیں احساس ہی نہیں تھا کہ اگر بالفرض نبوت جاری رہتی تو لوگوں کی کم بختی آئی رہنی تھی۔ انبیاء و رسل نے عذابوں کی ''بشارتیں'' سناتے رہنا تھا اور دنیا کو ''وقت'' پڑا رہنا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ سابقہ امتیں اللہ تعالیٰ کے حضور کس رنگ میں شکوہ کریں گی کہ مولا! ہمارا کیا قصور تھا؟ ہم پر رسولوں نبیوں کو کیوں بھیج بھیج کر ہمیں تباہ و برباد کر دیا گیا؟ جب ''قیام قیامت'' کو سب کا حساب/ احتساب ہوتا ہمارے اکاؤنٹس بھی سب کے ساتھ ہی چیک کر لئے جاتے۔

اور وہ قومیں تو شکایت میں مزید حق بجانب ہوں گی جنہیں یہ ''خوشخبری'' سنائی گئی ہے کہ تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں عذابوں کے مزے چکھنے ہوں گے۔۔۔ ہاں دوستو! پہلی اینٹ ٹیڑھی پڑ جائے تو یہ طے ہے کہ ثریا تک دیوار ٹیڑھی ہی اٹھتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ عذابوں کے مسلط ہونے کا تعلق انبیاء و رسل کی بعثت کے ساتھ اس طرح ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے پیاروں کو ماموراس لئے کیا تھا کہ وہ اعلان کر دیں لوگو! تمہارے غلط اعمال و افعال کے منطقی نتائج ہلاکت و تباہی کی شکل میں تمہارے سروں پر منڈلا رہے ہیں ان سے بچ جاؤ اور بچنے کا طریق کار یہ ہے کہ نئے سرے سے منصوبہ بندی کرو اور بہترین منصوبہ بندی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کے مطابق اپنے لئے وسیع تر سلامتی کی راہیں تلاش کر لو تا کہ تمہاری ذاتی اور معاشرتی زندگیاں حفاظت کے سائبان تلے آ جائیں۔ خاص طور پر اس پہلو کو نگاہ میں رکھو کہ ہوس زر سے بڑھ کر غافل کر دینے والا نشہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔ جنسی بے راہروی کا نمبر دوسرا ہے۔ پھر ہو

گا کیا کہ تم ''اسباب دنیا'' یعنی مال و دولت کی چھینا جھپٹی اور مارا ماری میں اس قدر منہمک ہو جاؤ گے کہ وہ آفاقی حوادث جو نیچر کی مسلسل فعالیت کا حصہ ہیں ان سے مامون ہونے/رہنے کی صلاحیتوں سے تہی ہو جاؤ گے اور اس طرح بارشیں ہو گئیں' سیلاب آ گیا' زلزلہ وارد ہو گیا تو تمہارا سب کچھ آن واحد میں برباد ہو کر رہ جائے گا۔ ذرا سوچو! کہ یہ سونے چاندی کے انبار تمہارے کس کام آئیں گے؟ ہاں دفاعی نظام کی مضبوطی کا تعلق صرف اس بات سے نہیں کہ جدید تر وسائل کو بروئے کار لا کر خطرات سے نمٹنے کے صرف اپنے لئے ''مادی بندوبست'' پورے کر لو۔ اس نہج پر کام کرنے سے پھر ایک کمی رہ جائے گی کہ وہ لوگ جو زیادہ وسائل کے مالک ہوں گے' جو اسباب کی خریداری پر زیادہ قادر ہوں گے' وہ تو اپنے لئے زبردست محلات تعمیر کر لیں گے اور غریب غرباء پھر تہی داماں' نہتے' بے دست و پا' لاچار رہ جائیں گے اور ''خوبان بوستاں'' کے مقابل ''سبزۂ بیگانہ'' کا جو تناسب ہے اس سے کون واقف نہیں ہے؟ یہ کہاں کی منصوبہ بندی اور انسانیت ہے کہ چند مخصوص متمول افراد یا ایک خاص خوشحال طبقہ اپنی جانوں اور اپنے اموال و اولاد کے گرد متین حصار کھینچ لے اور باقیوں کو نذر آتش ہونے دے یا پانیوں کی بے رحم لہروں کے سپرد کر دے؟ اس طرح تو بات پھر وہیں کی وہیں رہے گی۔

حل اس مسئلے کا یہی ہے کہ دولت اور وسائل کی تقسیم میں عدل کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ ملکی خزانوں پر غاصبانہ قبضوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ کرپشن کے ہر سوراخ کو بند کیا جائے۔ انفرادی زندگی پر اجتماعی زیست کو ترجیح دی جائے۔ قوانین فطرت کا شعور تعلیم کے ذریعے بیدار کیا جائے۔ حاکمیت' محکومیت کے ظلم کا خاتمہ کیا جائے۔ توہم پرستی کا استیصال کیا جائے۔ اخلاقی معیارات یعنی مستقل قدروں کا ادراک عام کیا جائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ نتائج و عواقب کے متعین سسٹم سے آگہی کا اہتمام کیا جائے۔ مطلب یہ کہ عبادت کا اصل مفہوم قوانین قدرت کی لم سے واقفیت ہے نہ کہ چند Rituals کے ذریعے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کا پروگرام عبادت ہے۔ اس بامعنی پس منظر میں عبادات کی ظاہری ادائیگی کی اہمیت اجاگر کی جائے کہ باقاعدگی کے اعجاز سے ان علامتوں کے ذریعے انسانی نفسیات پختگی کی ثروت سے مالا مال ہو جاتی ہے اور عہد نامے تازہ رہتے ہیں یوں یہ ذہنی تربیت عملی زندگی میں کارگر ثابت ہوگی۔ یعنی اگر پانچ وقت خدا سے + خود سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ میں فواحش و منکرات سے بچ کر رہوں گا اور پھر اس مسلسل یاددہانی کی برکت سے بچ کر دکھا بھی دیا ہے تو گویا ''قبولیت نماز'' کی سند ہاتھ آ گئی اور پھر جب ساری سوسائٹی اس قالب میں ڈھل گئی تو شہر کے صدر دروازے پر بڑے اعتماد سے

''فردوس بریں'' کا بیزآ ویزاں کیا جا سکتا ہے۔

صاحبو! یہ ہے انبیاء و رسل کی تبشیر و تنذیر کی تلخیص۔ اور یاروں نے اپنی دانشوری میں یہ معانی برآمد کر لئے کہ اگر دنیا میں نبی/رسول نہ آئے ہوتے تو خیر ہی خیر تھی' کوئی مصیبت' کوئی عذاب نازل نہیں ہونا تھا جیسا کہ اب قیامت تک صرف اس لئے عذاب نہیں آئے گا کہ کسی نبی/رسول کی تشریف آوری نہیں ہونی۔

واضح کر دیں کہ بحمداللہ خود ہمارا قرآنی عقیدے پر صد فی صد بھروسہ ہے کہ حضورﷺ خاتم النبین ہیں' ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا' نیا تو کیا' کوئی پرانا بھی نہیں آئے گا۔ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ اللہ کو آخر اپنی مخلوقات پر رحم آ گیا ہے کہ پہلے نبی/رسول بھیج بھیج کر انہیں میں نے بہت ستا لیا ہے' اب انہیں چار دن آرام سے جی لینے دوں۔ نبی/رسول۔۔۔ ہاں صاحبو! اب اس لئے نہیں آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ضرورت نبوت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس نے اپنی تعلیم کو انتہا سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد اسی مضمون میں ازسرنو ایم اے کرنے کو آپ کیا کہیں گے؟ اور پھر جب Division' Improve کرنے کی بھی احتیاج نہ ہو کہ ہزار میں سے ہزار نمبر تو پہلے ہی لے رکھے ہیں۔ لیکن کیا کریں یہاں تو امت کا یہ ''اعتقاد'' ہے کہ نہیں ایم اے کے بعد تو میٹرک بھی دوبارہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی سابق نبی کی Services مستعار لینا تحصیل حاصل نہیں تو اور کیا ہے؟ آفتاب نبوتﷺ کی موجودگی میں تابع انبیاء کی نبوتوں کے چراغوں کی اب بھلا کیا ضرورت ہے؟؟؟

مگر نہیں ٹھہریئے' ذرا غور کیجئے کیا حضورﷺ کی نبوت اب موجود ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے ہر مسلمان یہی کہے گا کہ موجود ہے' نہ صرف اب موجود ہے بلکہ قیامت تک کے لئے موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضرت اقدس محمد مصطفیٰﷺ قیامت تک کے لئے نبی/رسول ہیں تو پھر آپ کی لائی ہوئی شریعت کے اصول وقواعد وضوابط وقوانین کیا کبھی معطل بھی ہو سکتے ہیں؟ نہیں کبھی نہیں کہ ختم نبوت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ آپﷺ نے جس آسمانی دستور کو قرآن کی صورت میں نافذ کیا ہے' اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔ تو پھر ''عذاب و ثواب'' کے باب میں آپﷺ کی جسمانی موجودگی کو شرط کیسے اور کس حساب میں بنا دیا گیا ہے؟

کس قدر واضح نکتہ ہے کہ اقوام جن اعمال کی وجہ سے پہلے تعذیب و عذاب کی مستحق قرار پاتی تھیں' عین مین انہی اعمال و افعال میں آج مبتلا ہو کر دیکھ لیں' بالکل انہی عذابوں کی آج بھی حق دار ٹھہریں گی۔ کیا اب وہ صرف اس Edge پر بچ جائیں گی کہ کسی ''نئے نبی'' نے آ کر انہیں باخبر نہیں کیا تھا؟ یہی تو وہ نکتہ ہے جسے سمجھا نہیں گیا کہ پہلی قومیں جب آموختہ بھلا دیتی تھیں تو نیا نبی وہی سبق انہیں یاد دلا دیتا

تھا اور پھر جب اللہ نے نبوت کے سلسلے کو ختم کر دیا تو اسی عالمگیر صداقت کو مکمل و اکمل صورت میں بطور اتمام حجت آخری بار بیان فرما دیا کہ یہ ضابطہ پتھر پر لکیر ہے' یہ کبھی چونکہ مٹے گا نہیں لہٰذا اسے دوبارہ رقم کرنے کی اب ضرورت نہیں۔ اس پر عمل کرو گے تو فلاح پاؤ گے نہیں تو برباد ہو جاؤ گے اور اس طرح غارت ہو جاؤ گے کہ ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''۔ غور کی جا ہے کہ قرآن مجید میں سابقہ امم و ملل کی عبرتناک داستانوں کو محض قصہ کہانی کے طور پر بیان کیا گیا ہے یا ہمارے لئے ان تذکار میں کچھ عبرت کا سامان موجود ہے؟ اگر تو کوئی ایسی آسمانی ضمانت مہیا ہوگئی ہے کہ ہم جو جی چاہے کریں' کھل کھیلیں' اب ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تو پھر سینکڑوں آیات میں موعظت کے قصص کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور اگر اس میں ہماری راہنمائی کا اثاثہ موجود ہے تو پھر ہمارے ساتھ کوئی استثنائی معاملہ نہیں ہوگا۔ خدا کے لئے ایک بری قوم کی جگہ صالح قوم کا لانا کوئی مشکل نہیں ہے اور یہ قانون قدرت ہے کہ وہ بروں کی جگہ اچھوں کو لاتا رہتا ہے۔ ''اصول استبدال واستخلاف اقوام'' ایک ناقابل ترمیم وتردید سچائی اور دستور ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

اور اس صورتحال کو ''قانون مکافات عمل'' سے معنون کرنا بالکل درست ہے۔ اس قانون میں تعمیم ہے تخصیص نہیں۔ جو بھی قوانین خداوندی سے انحراف کرے گا مآل کار خسارا اٹھائے گا۔ چاہے وہ کسی بھی نبی کا امتی ہو اور چاہے وہ کسی نبی کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ باقی نبی کی تو اسی قدر ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوپر اترنے والی وحی کے نور میں لوگوں کو بروقت مطلع کر دیتا ہے کہ یہ راستہ سیدھا تباہی کے گڑھے کی اور جاتا ہے۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر نبی ان لوگوں کو یہ بری خبر (وعید) نہ سناتا یا سنانے کے لئے نہ آتا تو وہ تباہی کے گڑھے میں نہ گرتے۔ یہ تو ایسی ہی مثال ہے کہ کوئی بیمار شخص فزیشن کے پاس جائے اور وہ اسے دو ایک ٹیسٹ تجویز کر دے۔ اب پتھالوجسٹ یہ رپورٹ اس مریض کو تھما دے کہ صاحب آپ ذیابیطس کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس پر وہ مریض یوں ردعمل ظاہر کرے لیجئے جناب! نہ میں اپنا لہو لیبارٹری میں چیک کرواتا نہ مجھے شوگر ہوتی۔ مطلب یہ کہ جہاں مرغ بانگ نہیں دیتا کیا وہاں صبح نہیں ہوتی؟

انبیاء ورسل تو بمنزلہ اطباء وحکماء ہوتے ہیں جو بستی بستی' نگری نگری جا کر منادی کرتے ہیں کہ لوگو! اگر محفوظ و مامون رہنا چاہتے ہو تو ان ان باتوں کا خیال رکھو' یہ یہ پرہیز کرو اور پھر بیماری آزاری میں دوادارو بھی کر دیتے ہیں لیکن اگر کسی بستی کے مریض ڈھیٹ واقع ہوئے ہوں اور اپنے معالج اور اس کے علاج کو خاطر میں نہ لائیں اور پھر ہلاک ہو جائیں تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اگر یہ ڈاکٹر لوگ نہ ''مبعوث''

ہوئے ہوتے تو انہوں نے ہلاک نہیں ہونا تھا۔۔۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے کہ اس نے ہر قریے، ہر بستی، ہر دوارے ہر نگری میں اپنے انبیاء بھیجے یعنی اپنی ذمہ داری پوری کر دی وگرنہ ہلاک ہونے والی قوم روز قیامت اپنے رب سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوتی کہ جناب! آپ نے یہ ہمارے ساتھ کیا کیا کہ کسی ہادی، کسی رہبر کو نہ بھیجا اور ہمیں اچانک پکڑ لیا؟

اب اس موقع پر پھر پڑھئے اس آیت کو

وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا (۱۷/۱۵)

یعنی ''جب تک کسی بستی میں رسول نہیں بھیج دیا جاتا اس کی تباہی نہیں ہوتی''۔

اور اس کے ساتھ اگر ان آیات کو بھی پڑھ لیا جائے تو بات بالکل نکھر جاتی ہے۔

ذالک ان لم یکن ربک مھلک القریٰ بظلم و اھلھا غفلون۔ (۶/۱۳۲)۔

''تیرا رب یہ نہیں کرتا کہ کسی قوم کو اس کا تو علم ہی نہ ہونے دیا جائے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے انکار سے تباہی آتی ہے اور انہیں اس جرم کی پاداش میں تباہ کر دیا جائے کہ تم نے ان قوانین سے انکار کیوں کیا تھا۔ ایسا کرنا بڑی زیادتی ہے اور خدا کسی پر زیادتی نہیں کیا کرتا۔''

وما اھلکنا من قریۃ الا لھا منذرون۔ (۲۶/۲۰۸)۔

ذکریٰ وما کنا ظلمین (۲۶/۲۰۹)۔

''ہمارا انداز ہی یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس ہمارا پیغامبر نہیں آ جاتا جو انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کر دے اور اس طرح انہیں اس کا موقع بہم پہنچائے کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آ جائیں، ہم اس قوم کو ہلاک نہیں کیا کرتے۔ یہ تو بڑی زیادتی ہوتی کہ کسی قوم کو بغیر آگاہ کئے اور بغیر اصلاح کا موقع دیئے یونہی تباہ کر دیا جاتا۔ یہ ظلم ہے اور ہم کبھی ظلم نہیں کیا کرتے۔''

دوستو! خدارا اس مرحلے پر ایک لمحہ کے لئے رکیے اور ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو جو ہولناک زلزلہ آیا وہ کیا تھا؟ عذاب الٰہی یا اتفاقی حادثہ؟ طبعی آفت یا غیبی تنبیہہ؟

ایک طبقہ وہ ہے جو اسے عذاب قرار دیتے ہوئے نہیں تھکتا۔ لیکن اس طبقے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ عذاب کے حق دار صرف گناہگار ہوا کرتے ہیں۔

خود ہمارے متذکرہ فاضل دوست نے بڑی اچھی مثالیں دی ہیں کہ:

''عذاب کے نفاذ سے پہلے ماننے اور انکار کرنے والوں کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ امکان باقی نہیں رہتا کہ کسی ماننے والے پر عذاب نافذ ہو جائے اور کوئی انکار کرنے والا بچ جائے۔ اس بارے میں قرآن کے مطابق اتنی احتیاط برتی جاتی ہے کہ رسول کی بیوی بھی اگر انکار کرنے والوں میں سے ہو تو اسے الگ کر دیا جاتا ہے' جیسا کہ سیدنا لوطؑ کے معاملے میں ہوا (شعرا ۲۶/۱۷۱) اور اگر بیٹا بھی انکار کر دے تو وہ بھی نجات پانے والوں کی کشتی میں سوار نہیں ہو سکتا جیسا کہ سیدنا نوحؑ کے معاملے میں ہوا (ہود ۱۱/۴۳)۔''

ہم اگر یہ مثالیں پیش کرتے تو یوں کہتے کہ لوطؑ کی اہلیہ بھی اگر ایمان لے آتی یعنی قانون امن کی پناہ میں آ جاتی تو یقیناً بچ جاتی' اسی طرح نوحؑ کا صاحبزادہ بھی اگر سلامتی کے دستور کو تسلیم کر لیتا تو غرق ہونے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ فرعون بھی اپنے مظالم سے دستکش ہو کر رب موسیٰؑ کے وضع فرمودہ حفاظت کے قانون کا سچا طلبگار بن جاتا تو آج دنیا اسے ایک ہیرو کے طور پر جانتی۔ بنی اسرائیل اگر سلامتی کے شہزادے حضرت مسیحؑ کو ستانے کی بجائے ان کی پیش فرمودہ اعلیٰ قدروں کی حریم میں آ جاتے تو دربدری کے عذاب سے یقیناً بچ جاتے۔

اب فرمائیے اس حالیہ سانحہ کے سلسلہ میں کیا یہ عذاب الٰہی تھا؟ پوری زمین پر گھوم جائیے اور بدکاروں' بدمعاشوں' غاصبوں' چوروں' اچکوں' ڈاکوؤں' لٹیروں' فراڈیوں' سیاستدانوں' مفسدوں' بچوں کو اغوا کرنے والوں' ملاوٹ کرنے والوں' رشوت خوروں' ظالموں' سفاکوں' بدزبانوں' دہشت گردوں' بچوں کی عصمت ریزی کرنے والوں' شرابیوں' جواریوں' سودخوروں' جسم فروشوں' قاتلوں' سمگلروں' زانیوں' غریب ممالک پر چڑھائی کر کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والوں' جعلی پیروں اور علمائے سوء۔۔۔۔ سمیت ان گنت گناہگار ویسے کے ویسے دندناتے رہے ہیں۔ دور کیا جانا ہے اپنے پاکستان میں بھی ایسے ''ہیروں'' کا کوئی فقدان نہیں ہے۔ ان پر تو کوئی قہر نہیں ٹوٹا ہے۔

اللہ تعالیٰ تو عادل ہیں۔ کیا یہ ان کا عدل ہے کہ بروں کو صاف چھوڑ دیا ہے اور ان ناداروں کو اپنے شکنجے میں لے لیا ہے جو پہلے ہی دو وقت کی روٹی کو ترس رہے تھے۔ خاص طور پر ان بے شمار معصوم سکولوں کے بچوں کے متعلق کیا کہیں گے جن سے کبار گناہ تو کیا معمولی خطائیں بھی سرزد نہیں ہوئی تھیں؟ ظاہر ہے اس تناظر میں یہ حادثہ ہرگز ہرگز

عذاب الٰہی تو ہو نہیں سکتا۔ اور پھر جو عذاب الٰہی کا مستحق قرار پا جائے' مومنین کی ان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ پاکستان سمیت پوری دنیا کے نیک طینت لوگوں نے جس طرح زلزلہ زدگان کی مدد کی ہے' کیا خدائی فیصلے کو انہوں نے چیلنج کیا ہے؟ کیا خدا کے مقہوروں کی نصرت کر کے یہ خود عذاب خداوندی کو دعوت تو نہیں دے رہے ہیں؟ نہیں ہمارا نہیں خیال کوئی سنگدل سے سنگدل شخص بھی ایسا سوچ سکے۔ ہاں ایک آدھ شقی القلب مولوی نے یہ فتویٰ ضرور دیا ہے کہ اس حادثے میں مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت بھی جائز نہیں ہے کہ یہ کافر تھے[1]۔ اس حساب سے تو ان کے زخمیوں اپاہجوں کی مدد کے لئے بھی آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ باقی پوری دنیا کے نرم دل لوگوں نے اپنی روحوں کو جس طرح تڑپتا ہوا پایا ہے' اظہر من الشّمس ہے۔

اس صدمے کی حالت میں کوئی اختلافی بات کرنے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن کیا کریں کہ ایک ایلو پیتھک مذہبی پیشوا کی اس تضاد بیانی نے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہے۔ ۲۶ اکتوبر کے نوائے وقت لاہور میں آپ کے خطاب کی مفصل رپورٹ چھپی ہے جس میں پہلے تو آپ نے ایک دردمند انسان کی حیثیت سے یہ فرمایا ہے:

''۔۔۔انہوں نے کہا کہ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے۔ انہوں نے کہا کیا لاہور کراچی بداعمالیوں کے سب سے بڑے اڈے نہیں ہیں؟ کیا وہاں جہاں زلزلہ سے تباہی ہوئی ہے وہاں زیادہ بداعمالیاں تھیں' سزا وہاں ملنی چاہئے تھی اور جو ہزاروں معصوم بچے ہلاک ہوئے ہیں۔ ان کی بداعمالیاں کون سی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ کسی کے اعمال کی سزا کا عمل نہیں ہے یہ فورسز آف نیچر کی وجہ سے ہے۔۔۔''۔

یہ سٹیٹ منٹ پڑھ کر ہمیں حیرت ہوئی اور بے اختیار ہمارے منہ سے نکلا ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے''۔ لیکن ہماری یہ خوش فہمی جلد ہی زائل ہو گئی جب آگے چل کر آپ نے یہ فرما دیا:

''جب اجتماعی عذاب آتا ہے تو اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اور معصوم بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نیک اور بدکار کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ عذاب اکبر صرف ان قوموں پر آیا جن پر نبی بھیجے گئے اور ان کی نافرمانی کی صورت میں ان قوموں کو ختم کر دیا گیا۔ ان کے نام و نشان مٹا دیئے گئے۔ اب ایسے عذاب ختم ہو گئے ہیں کیونکہ نبی نہیں آئے گا اب صرف اجتماعی ہلاکتیں ہو سکتی ہیں اور صرف حضرت عیسیٰؑ اپنی آنکھ سے اپنی قوم کا عذاب دیکھیں گے اور کانے

---

[1] روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۵ء

دجال کو اپنے ہاتھ سے ماریں گے۔ انہوں نے کہا کہ جزوی ہلاکتیں آتی رہیں گی اور مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امت محمدیؐ پر گیارہویں صدی سے اب تک متعدد عذاب آ چکے ہیں۔۔۔ پاکستان کے موجودہ حالات کے حوالے سے عذاب اکبر تین شکلوں میں آ سکتا ہے اور پہلی شکل پاکستان ۵ سے ۶ حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ دوسری شکل میں بھارت پاکستان پر قبضہ کر لے گا جبکہ تیسری شکل میں پاکستان بھارت کی تابع سٹیٹ بن کر رہے گا۔۔۔!''۔

لگتا ہے موصوف کو جیسے معقول گفتگو کرنے کے بعد یکا یک خیال آیا' کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا میں تو ایک عدد مولوی ہوں' پھر اپنے مخصوص مولویانہ انداز میں انہوں نے تکلم فرمایا بلکہ اچھا خاصا ''خطبہ الہامیہ'' ارشاد فرما دیا ہے کیونکہ اتنے تضادات کسی غیر الہامی کلام میں ہو نہیں سکتے۔

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن پس جانے کا قصہ بھی حل ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تو طیب کو خبیث سے علیحدہ کرنے پر نہ صرف قادر ہیں بلکہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اوپر اپنے فاضل دوست کے حوالے سے مثالیں درج ہو چکی ہیں کہ لوطؑ کی زوجہ اور نوحؑ کے صاحبزادے سلامتی کے منکر ہونے کے سبب ہلاکت کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح اہل ایمان (قانون امن پر یقین رکھنے والوں) میں سے کوئی بھی ہلاک نہیں ہوا۔ پھر یہ گیہوں کے ساتھ گھن پس جانے والے قضیے کی روٹ کیا ہے؟

دراصل قرآن مجید کی سورۃ انفال میں ایک آیت ملتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

واتقو فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خآصة واعلموآ ان الله شديد العقاب (۸/۲۵)۔

اس کا عام طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔

''اور اس فتنہ سے ڈرتے رہو کہ تم میں سے صرف ظالموں کو نہیں پہنچے گا اور یاد رکھو کہ اللہ کا عذاب یقیناً سخت ہوتا ہے۔''

سوال یہاں ایک نہیں دو ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ عادل ہیں وہ مظلوموں کے گھن کو کیا ظالموں کے گیہوں سے جدا نہیں کر سکتے؟

(۲) خبیث وطیب کو انہوں نے اس طرح وقت عذاب علیحدہ کیا ہے کہ حضرت لوطؑ کی اہلیہ اور حضرت نوحؑ کے صاحبزادے نہیں بچائے گئے اور ان عذاب کا شکار ہونے والوں کے ساتھ مومنین کا گھن کہیں موجود نہیں تھا۔ پھر اب کیا ہوا ہے جو گھن کو گیہوں کے ساتھ پیسنا مجبوری بن گئی ہے؟

پہلے آپ اس عظیم آیت مبارکہ کا صحیح مفہوم سنئے

پھر بات آگے چلائیں گے:

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ اگر جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اس قسم کے تذبذب میں گرفتار ہوں) تو اس سے جو مصیبت آتی ہے وہ صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہتی۔ وہ سارے کے سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بڑا سخت واقع ہوا ہے (اجتماعی اعمال کے نتائج بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سے بہت محتاط رہو اور ایسا انتظام کرو کہ تمہارے ہاں ایسی صورت پیدا نہ ہونے پائے)۔

ذکر چونکہ زلزلے کا ہو رہا ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''سورۃ زلزال'' سے اس نکتے کی ابتدا کی جائے۔ یہ سورۃ ننانویں ہے' پارہ تیسواں' مفہوم و متن ہم نقل کر رہے ہیں آیت نمبر ۶ تا آیت نمبر ۸ کا۔

یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم o فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ o ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ' o

''اس وقت ایک نئے نظام عدل کی بساط بچھے گی۔ مجرم اور شریف انسان الگ الگ ہو جائیں گے اور ہر گروہ کے اعمال کے نتائج نمایاں طور پر سامنے آ جائیں گے۔

جو ذرہ برابر بھی قانون خداوندی کا اتباع کرے گا اس کے حسن عمل کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا۔

اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا اس کی سزا پائے گا'' (۶۔۸/۹۹)۔

گویا اللہ تعالیٰ کا نظام عدل بڑا ہی باریک بین ہے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ پھر جو گیہوں کے ساتھ وہ گھن کو پیس رہا ہے تو یہ عدل کے مطابق ہے یا منافی؟

اگر سورۃ انفال کی اس آیت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یقین کر لینا پڑتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ایسا لطیف بیان' نازک ترین جہتوں کو نہایت توازن سے سنبھالنے والے خدا کا ہی ہو سکتا ہے وگرنہ ''بادی النظر'' کا عادی انسان تو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھا جائے۔

آیت کریمہ میں فی الحقیقت متذبذبین کا ذکر ہے یعنی ایسے لوگ جو یقینیات کی کامل ثروتوں سے محروم ہوں' جلد ہی گھبرا جانے والے' جن کا قدم رپٹ جانے کا خوگر ہو' عزم کے فقدان والے' غیر مستقل مزاج۔۔۔ اگر ایسے ''ڈھلمل'' یقین والے لوگ کسی طرح مرکز ملت کا حصہ بن جائیں پھر منزلوں کا کھوٹا ہونا ''طے شدہ'' ہے۔

میرؔ کیا خوب شعر کہہ گئے ہیں: ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

بات اقبالؔ نے بھی عمدہ کہی ہے: ؎

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے

مانا کہ اللہ نے اپنے نیک بندوں کو محولہ واقعات میں محفوظ رکھا۔ سوال یہ ہے کیوں؟ جواب یہ ہے کہ وہ بندے خود خدا کے قانون حفاظت کے سچے طالب تھے اور ان کا اس نظام پر پختہ اعتماد تھا کہ جو ان سچوں اور مفلسوں کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے مجسم امن ہے لہٰذا سلامتی خود چل کر ان کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ بھئی! جو کشتی میں ہی آ بیٹھا' جو نبی کی معیت میں ہجرت کر گیا اس پر عذاب کیوں آنے لگا؟ ہاں وہ نافرمانی کرتا اور یہ کہتا کہ نہ میں کشتی میں سوار ہوں گا نہ تیرے ساتھ ہجرت کروں گا' میں تو ''اپنے اللہ'' پر بھروسہ/توکل کر کے یہیں رہوں گا۔ پھر وہ بچ کے دکھاتا!!! ناممکن تھا کہ وہ محفوظ رہتا۔ سو وہ جو سنگ ''ڈوبے'' ہیں وہی سنگ ''ترے'' ہیں۔

اب آیئے اس جماعت کی اور جو متزلزل ایمان والوں کی ملونی اور ملاوٹ سے ترتیب پائی ہوئی ہے' ان کا حال تو یہ ہوتا ہے ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

یارو! ہمیں تو پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی اللہ عذاب نازل کرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ ہر مقام پر یہ ناخلف انسان ہی دکھائی دیا ہے جو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر عذابوں کو چھونے کا متمنی ہے۔ اب اگر کمزور ایمان والوں کی شمولیت سے سادہ لوحوں کا کارواں منزل سے ہمکنار ہونے کی بجائے جنگل ہی میں خود پر شام کو اتار لے تو ان معصوموں کو کون ضمانت دے گا کہ جنگلی درندے تمہیں نہ صرف ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے بلکہ ہر طرح کی حفاظت کے لئے رات بھر پہرا دیں گے؟ ؎

اپنی اپنی انا کو بھلایا جا سکتا تھا
شاید سارا شہر بچایا جا سکتا تھا
سارے سفر میں ہم نے رہبر ہی کی مانی
ورنہ سیدھی راہ پہ آیا جا سکتا تھا

مختصر یہ کہ جو گروہ تکلیف سے بچنا چاہے گا اور قوانین خداوندی کے مطابق احسن تدبیر کرے گا وہ اس تکلیف سے لازماً بچ جائے گا اور جس کی منصوبہ بندی میں نقائص اور خلا رہ گئے وہ اس کے ساتھ ساتھ ''بے قصوروں'' کے لئے بھی موجب اذیت بن سکتا ہے۔

عظیم مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کے زرین الفاظ میں:

''۔۔۔قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جن حوادث کا تعلق طبعی اسباب (Physical Causes) سے

ہے، وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ وہ مومن اور کافر۔ یا نیکوکار اور فاسق و فاجر میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ ان سے حفاظت بھی طبعی اسباب کی رو سے مل سکے گی اور ان کی رو سے واقع ہونے والے نقصان کا ازالہ بھی طبعی اسباب و وسائل کے ذریعے ہی ممکن ہوگا (مثلاً) دریا کے کنارے بسنے والے گاؤں کے باشندے اگر دریا کا بند باندھنے میں کوتاہی برتیں گے تو سیلاب ان لوگوں کے گھروں کو بھی بہا کر لے جائے گا جو اس کوتاہی کے ذمہ دار تھے اور ان کے گھروں کو بھی جو اس سے بری الذمہ تھے۔ وہ خدا کے نیک بندوں کے گھروں کو بھی اسی طرح تباہ کر دے گا جس طرح فاسق و فاجر لوگوں کے گھروں کو۔ حتیٰ کہ سیلاب، مسجد اور مندر میں بھی تمیز نہیں کرے گا۔''

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں:

''قرآن اس بات پر کیوں زور دیتا ہے کہ اس امر کی خاص احتیاط برتو کہ معاشرہ میں غلط ذہنیت اور مفسدانہ کردار کے لوگ بار نہ پانے پائیں۔ وہ دریا کا بند تعمیر کرنے میں سیمنٹ کی جگہ ریت بھر دیں گے اور پھر ساری بستی سیلاب کی نذر ہو جائے گی۔ اجتماعی تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے انفرادی ''نیکیاں'' کچھ کام نہیں دیتیں۔ اس کے لئے صحیح (قرآنی) نظام کی ضرورت لاینفک ہے''۔ (مطالب الفرقان، جلد ششم، ص۸۲۔۸۴)۔

بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ کہیں کوئی آفت آجاتی ہے تو اس کی حیثیت محض ایک حادثے کی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ خاص عذاب الٰہی ہرگز نہیں۔ ہاں مخلوق خدا کے لئے باعث آزار وہ ضرور ثابت ہوگا اور اس آزاری و اذیت کا اساسی سبب اجتماعی نظام میں وہ خامی ہوگی جو دانستگی یا نادانستگی میں ''کرتاؤں دھرتاؤں'' سے رہ گئی ہوگی۔

اس پس منظر میں ۸۔اکتوبر کا سانحہ اللہ کی طرف سے مسلط ہونے والا عذاب تو بالکل بھی ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں ایک لاکھ سے زائد افراد کی موت اور اتنے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کی جسمانی معذوری اس لئے بھی رلا دینے والی ہے کہ یہ بیچارے واقعی معصوم تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس بے بصر زلزلے نے **''گیہوں'' کو چھوڑ دیا ہے اور صرف ''گھن'' کو پیس کر رکھ دیا ہے۔ یا پھر ''گھن'' کو چھوڑ دیا ہے اور ''گیہوں'' کو پیس کر رکھ دیا ہے۔** بہرحال ایسی بے عدالتی کو اللہ سے منسوب کرنا شقاوت ہے۔ ہاں ہمیں یہ دکھ دینے والا واقعہ جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ **اس ابتلا کا موجب کہیں ہمارے حکمران تو نہیں ہیں؟**

آخر یہ قوم اس ریاست کو ٹیکس دیتی ہے۔ جو

وسائل حکومت کے قبضے میں ہیں انہیں ایسے حادثات کے مقابلے کے لئے خرچ کرنے کی بجائے اپنے تعیّشات پر صرف کیا گیا ہے' کیا جا رہا ہے۔ اکثر ممالک میں جنگ کے خوف کو Exploit کر کے دفاع کے عنوان سے ملک کے بہترین وسائل خرچ ہو جاتے ہیں۔ کیا صرف ''امن'' اختیار کر لینے سے انسانیت کے مستقبل کو شانتی کی نوید عطا نہیں کی جا سکتی؟ نیز ہمارے سیاسی حکمران جس اعلیٰ سطح کی زندگی گزارنے کے خود کو مستحق گردانتے ہیں کیا واقعی وہ قومی خزانے پر اس بوجھ کا جواز رکھتے ہیں؟ جاگیرداری نظام کے خاتمے سے کیا عام آدمی کے گھر میں خوشحالی آئے گی یا نہیں؟ کروڑوں اربوں روپے خانقاہی نظام اینٹھ لیتا ہے' اس روپے پر نظر ثانی سے کیا عام پاکستانی کا معیار زندگی بہتر نہیں ہوگا؟ کیا ہمارے معلمین اپنے حصے کا کردار ادا کر کے کچھ ایسی آگہی کا انصرام نہیں کر سکتے کہ معصوم عوام کچھ دیر کے لئے اپنی معصومیت سے دستبردار ہو کر ظلم کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں؟

علاوہ ازیں کوئی ہمارے پیشواؤں کو نہیں سمجھا سکتا کہ قوم کو غلط سمتیں دے کر مزید گمراہ نہ کرو۔ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ عذاب اور نبی لازم و ملزوم ہیں۔ جن محترم شخصیت کے عارفانہ بیان میں سے ایک اقتباس ہم نے نقل کیا ہے۔ اس میں ایک طرف آپ نے یہ فرمایا ہے کہ عذاب اکبر اب ختم ہو گئے ہیں کہ کسی نبی نے نہیں آنا۔ آگے چل کر نہ صرف باقاعدہ عذاب اکبر کی ''بشارت'' دی ہے بلکہ بطور ''آخری نبی'' حضرت عیسیٰؑ کی آمد کا ذکر بھی فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ان کے نزول کے بعد ان کی قوم پر عذاب خداوندی نازل ہوگا۔ اب ان مکرم سے کون پوچھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی قوم کون سی ہوگی؟ عیسائی یا مسلمان؟ کیونکہ ساری روایتی پیش گوئیاں تو یہی بتاتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے بحیثیت غیر تشریعی نبی نازل ہوں گے۔ یہ بھی دلچسپ رہی کہ وہ بگڑے ہوئے مسلمانوں کی طرف مبعوث ہوں گے اور عذاب نازل ہوگا ''ان کی قوم'' یعنی عیسائیوں پر۔ شاید اس مژدے کے بعد ہمارے عیسائی بھائی تو یسوعؑ کا انتظار چھوڑ دیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دعائیں کریں کہ آپؑ آسمانوں پر ہی تشریف رکھیں کیونکہ آئیں گے تو عذاب کا تحفہ ہی لے کر آئیں گے۔ مزید ان سے استفسار کی کون جرأت کرے گا کہ تین تین شکلوں کے عذابوں کا جو نقشہ آپ نے مرتب فرمایا ہے ان ''انذاری پیش گوئیوں'' کا ماخذ کیا ہے؟

آخر میں ایک اور گزارش ہم نے اپنے فاضل دوست کی خدمت اقدس میں بڑے احترام کے ساتھ پیش کرنی ہے کہ اپنی تحریر میں آپ نے یہ عجیب سا فلسفہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

''نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے۔ اللہ کا ہر رسول نبی

ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازم نہیں ہے کہ رسول بھی ہو۔ ایک قوم کی طرف جب رسول مبعوث کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے زندہ رہنے کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے رسول پر ایمان لانا۔ اگر وہ اس سے انکار کر دی تو پھر اس کے زندہ رہنے کا حق ختم ہو جاتا ہے اور اس انکار کی پاداش میں اس پر اس دنیا میں عذاب نافذ ہو جاتا ہے۔۔۔ نبی کا انکار کر کے قومیں زندہ رہ سکتی ہیں اور بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ نبی اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔۔۔ لیکن رسول کا معاملہ یہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر صورت میں غالب رہتا ہے۔۔۔!''۔

اپنی متذکرہ تحریر کی ابتدا میں موصوف نے اپنے استاد گرامی کے حوالے سے یہ تحسینی کلمات بھی لکھے ہیں کہ انہوں نے ان مسائل کو اس طرح دو اور دو چار کی طرح حل کر دیا ہے کہ علم کی دنیا میں اب اس سے صرف نظر ممکن نہیں رہا۔

ظاہر ہے نبی اور رسول کے مابین امتیاز کا یہ فارمولا دو اور دو جمع چار بھی ان کے استاد محترم ہی کی دین ہو گا وگرنہ قرآن مجید تو اس خیال کی قطعاً تائید نہیں کرتا کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق ہوتا ہے۔ (تفصیل کے خواہشمند علامہ پرویزؒ کی تصنیف ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کے متمنی جون ۱۹۶۶ء کے ''طلوع اسلام'' میں شائع ہونے والی خط و کتابت سے مستفید ہو سکتے ہیں)۔

بہرطور ان اکابر کے رشحات قلم کی تلخیص یہ ہے کہ ہر نبی رسول ہوتا ہے اور اسی طرح ہر رسول کے پاس نبی کا ٹائٹل بھی ہوتا ہے۔ قرآن کے اسلوب میں نبی سے مراد وہ بلند مرتبہ شخصیت ہے جسے اللہ تعالیٰ اخبار غیب پر بذریعہ وحی مطلع کرے۔ یہ عظیم منصب ملنے کے بعد اس کے فرائض کی ادائیگی کے مراحل آتے ہیں۔ اب وہ بطور رسول وحی کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کا پابند ہے۔ یعنی خدا کا یہ فرستادہ

> ''خدا سے کتاب پانے کی جہت سے نبی ہو گا اور اس کتاب کو دوسروں تک پہنچانے کی جہت سے رسول۔''

ہمارے فاضل دوست نے جانے یہ توضیح کیوں نہیں کی' آخر نبی اور رسول میں فرق ہے تو وہ ہے کیا؟ ان کی تحریر سے تو بس اتنا پتا چلتا ہے کہ رسول سدا غالب رہتا ہے اور نبی (رسالت سے خالی صرف نبی) مغلوب بھی ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ جلالی بیان بھی داغا ہوا ہے کہ جو قوم اپنے رسول پر ایمان نہیں لاتی اس سے زندہ رہنے کا حق چھین کر اسے نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔

یہ تو نرا پرا جبر ہے' اگر صرف انکار رسول پر ہر شخص کو موت کے گھاٹ اتار دینا منشائے خداوندی ہوتا تو یقیناً وہ کسی

کومنکر پیدا ہی نہ کرتا۔قرآن مجید میں کئی رسولوں کا ذکر موجود ہے اوران کے منکرین آج تک موجود ہیں۔مثلاً حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ان کے منکر یہودی کیا دنیا سے ختم ہو گئے ہیں؟ واضح رہے کہ جناب مسیحؑ کو اللہ نے نبی بھی کہا ہے اور رسول بھی۔ اسی طرح ہمارے آقا حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ تو تمام اقوام کی جانب نبی اور رسول بن کر آئے ہیں۔کیا جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا' ان سے جینے کی Option چھین لی گئی ہے؟

اگرچہ ہمارے فاضل دوست نے تو اپنی تحریر میں واضح نہیں کیا لیکن نبی اور رسول کے درمیان ایک فرق اور بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رسول' صاحب شریعت (صاحب کتاب) نبی کو کہا جاتا ہے جبکہ نبی کے پاس نئی شریعت نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی رسول کا تابع ہوتا ہے۔ مانا کہ صدیوں سے یہ غیر قرآنی تقسیم ہمارے بعض اکابرین نے کر رکھی ہے لیکن ''غیر تشریعی نبی'' کے خیال کو احمدیت نے نہایت شدومد سے عام کیا ہے' کیونکہ وہ مرزا صاحب کو حضور ﷺ کا متبع نبی ثابت کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔کیا کیا جائے خود ہمارے مسلمان علمائے کرام بھی عیسیٰؑ کو حضور ﷺ کا تابع نبی یقین کرتے ہیں۔

قرآن بہرحال تابع' ظلی' بروزی' مقتدی' متبع' عکسی' مطیع' حلولی' امتی' معاون' پیروکار' مقلد' ماتحت' فرمانبردار نبی وغیرہ کی اقسام کو نہیں مانتا' وہ ہر نبی کو صاحب کتاب کے اعزاز سے معزز گردانتا ہے۔ اور وحی کو ہی وہ ''کتاب'' کہتا ہے اور بنا وحی کے کوئی نبی ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اور اللہ کی وحی ہوتی کیا ہے' اوامر و نواہی کا مجموعہ۔یہی شریعت ہے۔اس اعتبار سے ہر نبی صاحب شریعت ہوتا ہے۔دراصل ''شریعت'' سے ہم یوں Confuse ہو جاتے ہیں کہ گمان کرتے ہیں جیسے نئی شریعت کا مطلب پہلی شریعت کی کلیۃً تنسیخ ہے۔درآں حالیکہ بنیادی اصولی احکام شریعہ کبھی منسوخ نہیں ہوتے۔اللہ کی توحید ہر نبی' ہر رسول' ہر کتاب' ہر وحی کا مشترک مضمون ہے۔کیا کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ کسی نبی نے یہ تعلیم دی ہو کہ خاکم بدہن خدا اکیلا نہیں دو تین چار ہیں۔مگر نبی کے آنکھیں موندتے ہی اس کی امت کے احبار و رہبان نے ثنویت' تثلیث اور ابن اللہ وغیرہ کے عقائد گھڑ کر شرک کے ابواب وا کر دیئے چنانچہ اللہ نے پھر جس بھی نئے نبی کو مبعوث کیا' اسے وہی حقیقی قدیمی تعلیم ہی وحی کی جس نے علمائے سوء کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کو دور کیا۔اس طرح اساسی ضوابط بہرطور وہی رہے۔ ہاں زمانے کے تقاضوں کے تحت بعض نئے احکامات بھی دیئے جاتے رہے کئی نئی ہدایات سے بہرہ مند فرمایا جاتا رہا' مسائل کائنات کے نئے گوشوں کو سامنے لایا جاتا رہا۔۔۔اور یہ سلسلہ جناب نوحؑ سے جناب مسیحؑ تک چلتا رہا۔انسانوں کے اجتماعی عقلی معیارات کے تناسب سے وحی تعلیم بن کر انبیاء کرام پر اترتی رہی۔ بنیادی اصول وہی

رہے۔ وہ کبھی منسوخ نہیں ہوئے۔ چاہے آسمانی اصولوں کی تعداد کتنی ہی مختصر تھی بہرحال وہ ''کتاب'' ہی کہلائی کہ کتاب ضروری نہیں پانچ سات سو کاغذی صفحات کے مجموعے کو ہی کہا جائے اور پھر ان کتب سماوی کا ''مصنف'' ظاہر ہے ایک ہی ہے لہٰذا بعض اوقات ایک ہی وقت میں بھی اس نے وقتی تقاضوں کے مطابق ایک جیسے اصول وقوانین ایک سے زیادہ انبیاء کو دے کر ''خدائی مشن'' سونپ دیا۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے دونوں صاحبزادے جناب اسماعیلؑ اور جناب اسحٰقؑ اوپر تلے نبی ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلا' حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کو نبوت ملی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نہ صرف ایک ہی وقت میں نبی ہوئے بلکہ اخوت کے رشتے میں بندھے ہوئے ان انبیاء کو Task بھی ایک ہی دیا گیا۔ آگے حضرت زکریاؑ اور ان کے لختِ جگر حضرت یحییٰؑ کو نبوت ملتی ہے اور موخر الذکر شخصیت حضرت عیسیٰؑ کے معاصر ہیں۔ اور قابل غور نکتہ ہے کہ یہ سب انبیاء رسول کے لقب سے قرآن میں ملقب ہیں۔ اب کیا یہ سب ایک دوسرے کی شریعتوں کو منسوخ کرنے والے تھے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں لیکن اس کے باوصف ان میں سے کوئی ''غیر تشریعی نبی'' نہیں تھا۔ ہر ایک کے پاس ''اپنی'' شریعت تھی جو اسے اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئی تھی اور وہ شرعی احکام ایک ہی الوہی پروگرام کو آگے بڑھانے والے تھے۔ چنانچہ جتنے بھی انبیاء ورسل آئے بطور ہادی انہوں نے ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔ لیکن ظاہر ہے ہر کسی کا متعین دائرہ کار تھا اور خاص قوم اور خاص علاقہ تھا۔

پھر ذہن انسانی جب ارتقاء کے مراحل طے کر کے اس قابل ہو گیا کہ اب اسے آخری شریعت اپنی مکمل حالت میں ارمغان کر دی جائے کہ قیامت تک اس میں ترمیم وتنسیخ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کل تعلیمات کا اصولی اثاثہ تیار کر کے قلب محمد ﷺ پر نازل کر دیا۔ یہ تعلیم اس قدر جامع ہے کہ اسے کسی خاص کلچر میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ کسی مخصوص علاقے کے لئے یہ مؤثر نہیں ہے' جغرافیائی حد بندیاں اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتیں' کسی نسل کے معاملات تک اس کے حلات محدود نہیں ہیں اور خاص طور پر اسے Time میں Reduce نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ہر فرد کی مکمل ضرورتوں کے حوالے سے اسے بھرپور ہدایت نامہ کہا جا سکتا ہے۔ اب دیکھا جائے تو یہ دعویٰ معمولی نہیں ہے۔ ایک چیلنج ہے بڑا زبردست چیلنج اور اسے وہی قبول کر سکتا ہے جو راہنمائی کے باب میں مستفسر کے ہر سوال کا جواب قرآن سے پیش کرنے اہلیت رکھتا ہو۔

ظاہر ہے اس اہلیت کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس کا ختم نبوت پر اعتقاد ہو اور خاتم النبین پر اعتماد ہو۔ جو کسی مسیح موعود اور مہدی معہود کا منتظر نہ ہو۔ جو اس قرآن کی کسی آیت

تو کیا ایک شعشہ کو بھی منسوخ نہ سمجھتا ہو۔لیکن کیا کیا جائے کہ اس امت کے صوفیاء و اکابر کی ایک طویل فہرست ہے جو مکالمہ ومخاطبہ کی نہ صرف قائل ہے بلکہ کشف والہام کی مدعی بھی ہے۔ جب اللہ حضورؐ کے بعد بھی براہ راست چنیدہ بندوں کو اپنے کلام سے نواز رہا ہے تو پھر ختم نبوت کے کیا معنی ہوئے؟ اسی طرح یہی اسلاف باقاعدہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ شریعت کے لحاظ سے آخری نبی/رسول ہیں ان کے بعد غیر تشریعی انبیاء کا سلسلہ جاری ہے۔کم از کم حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے تو سبھی قائل ہیں۔ پھر آخری نبی تو حضورؐ نہ ہوئے حضرت عیسیٰؑ ہی ہوئے۔ پر اس کا بھی ان کے پاس جواب گھڑا ہوا موجود ہے کہ آخر میں آنا تو فضیلت کی بات ہی نہیں اور اپنے موقف کی تائید میں یہاں تک فرمادیں گے۔

''اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہوتو پھر بھی خاتمیت محمدیؐ میں کچھ فرق نہ آئے گا''۔

بنابریں ان اجرائے نبوت کے قائلین کے لئے نبی اور رسول میں فرق کرنا غالباً ضروری بھی تھا۔لیکن غیر قرآنی عقائد اختیار کرنے میں ایک مسئلہ بہرحیث ساتھ ساتھ رہے گا کہ ''مجموعۂ اضداد'' بننا پڑے گا۔حضرت عیسیٰؑ کو لانے کے لئے یہ تانا بانا بنا گیا کہ وہ صاحب شریعت نہیں ہوں گے بلکہ حضورﷺ کے ماتحت نبی ہوں گے۔مگر قرآن کو کہاں لے جائیں گے جو انہیں ''صاحب کتاب'' نبی قرار دیتا ہے اور انہیں رسول بھی کہتا ہے اور ان محترموں کی نظر میں رسول صاحب شریعت نبی ہوتا ہے۔اور پھر محولہ بزرگ (ایلو پیتھک مذہبی پیشوا) کے مطابق تو وہ رسالت کو یوں بھی کوالیفائی کرتے ہیں کہ جب آپؑ آئیں گے تو اپنی قوم کے لئے عذاب کا ''نذرانہ'' بھی لائیں گے اور اپنی آنکھوں سے اپنی قوم کو گرفتار تعذیب پائیں گے۔گویا وہ رسالت سے تہی عام نبی نہیں ہوں گے۔

غور کیجئے جب وہ رسول نبی ہوں گے' عذاب بھی لائیں گے' صلیب کو توڑ کر' خنازیر کا شکار کر کے' کانے دجال کو مار کر غالب بھی آجائیں گے تو پھر وہ صاحب کتاب وشریعت کیوں نہیں ہوں گے؟ نیز ان پر وحی اترنے کی روایات بھی دستیاب ہیں۔

تاویلات کا کیا ہے جتنی چاہیں کرتے چلے جائیں' جب خلاف قرآن ایک عقیدہ تراش ہی لیا ہے تو پھر اسے ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور تو صرف کرنا ہی پڑے گا۔ وہ الگ بات کہ تضادات کی بارش تیز سے تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔

اس مرحلے میں ہم قرآنی فیصلے کو ضرور Quote کریں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

كان الناس امة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين و منذرين و انزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه (۲/۲۱۳)۔

چونکہ نوع انسانی کو ایک امت کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا تھی اس لئے خدا نے انبیاء کو بھیجا جو اعمال صالح کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دینے والے اور اعمال بد کے دردناک نتائج وعواقب سے آگاہ کرنے والے تھے اور ان سب کے ساتھ کتاب (ضابطہ قوانین) نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کر دے۔

اس آیت مبارکہ کے مطالعہ سے کم از کم یہ تو طے ہوا نا کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہوا ہے جو صاحب کتاب نہیں تھا۔ مراد یہ کہ ہر نبی کو کتاب دی گئی ہے۔

یعنی اگر رسول کے لئے صاحب کتاب ہونا شرط ہے تو اس شرط کو بحمداللہ ہر نبی بکمال وتمام پورا کرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہر نبی رسول بھی ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ سورۃ حدید کی یہ آیت ضرور پڑھیئے۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبينٰت وانزلنا معهم الكتاب (۵۷/۲۵)۔

''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتابیں نازل کیں۔''

جیسے کوئی نبی ''بے کتاب'' نہیں تھا' بعینہٖ کوئی رسول بھی ''بغیر کتاب'' کے مبعوث نہیں ہوا۔۔۔ جب کتاب ہی نبی کو ملی' کتاب ہی رسول کو عطا ہوئی تو نبی اور رسول کی کتاب میں فرق کیا ہوتا ہے؟ (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے بات کسی استہزاء کی نہیں' ہمیں ہرگز تعجب نہیں ہوگا کہ اگر ہمارے فاضل احباب کی طرف سے یہ جواب آ جائے کہ نبی کو غیر مجلد کتاب ملتی ہے جبکہ رسول کو مجلد)۔

یہاں ایک نکتے کی ذرا مزید تصریح کر دیتے ہیں کہ اگر ''ماتحت نبی'' کا جواز ہوتا تو حضرت ہارون کی ماتحتی سب سے زیادہ Justified ہے کہ حضرت موسیٰؑ بارگاہ ایزدی میں خود درخواست گزار ہیں کہ:

واخی هٰرون هوا فصح منی لسانا (۲۸/۳۴)۔

''میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ (دربار فرعون میں) بھیج دے کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی عرضی منظور فرما لی اور ہارونؑ ان کا بوجھ بٹانے والے اور ان کی قوت بڑھانے والے ثابت ہوئے۔ اس پس منظر میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہارونؑ کی حیثیت ''معاون نبی'' کی ہے۔ آیئے دیکھتے

ہیں کہ قرآن مجید ہارونؑ کو ''عام نبی'' قرار دیا ہے یا رسول؟

''یہ کوئی نیا دین نہیں، وہی دین ہے جو نوحؑ اور اس کے بعد دیگر انبیاء کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا۔۔۔ جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کو دیا گیا تھا۔ جو عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کو دیا گیا تھا۔ یہی ضابطہ حیات (دیگر انبیاء کی طرح) داؤدؑ کو بھی دیا گیا تھا اور خود یہودیوں کے پیغمبر موسیٰؑ سے بھی خدا نے یہی باتیں کی تھیں۔

غرضیکہ تمام انبیائے سابقہ کو یہی دین دیا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں لیکن بعض کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ذکر کیا ہو یا نہ، اصلاً ہر رسول کو یہی دین دیا گیا تھا اور رسول دنیا کی ہر قوم کی طرف آئے تھے۔'' (۴/۱۶۳۔۱۶۴)۔

دیکھ لیجئے حضرت ہارونؑ کو بھی زمرۂ رسل میں شامل کیا گیا ہے۔ پہلے انہیں نبی کہا ہے پھر انہیں رسول کے تخاطب سے نوازا ہے۔ اب رسول ہونے کے ناتے کیا وہ موسیٰؑ سے کوئی الگ شریعت رکھتے تھی جو موسیٰؑ کی شریعت کو منسوخ کر دینے والی تھی؟ اسی آیت کو اگر بنظر غائر پڑھ لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ بنیادی اصولی تعلیم تمام انبیاء و رسل کی ایک ہی تھی اور سب ایک دوسرے کے بھائی تھے۔

ہم اپنے فاضل دوست کی خدمت میں بصد ادب یہ گزارش کریں گے کہ قرآن کو دو اور دو چار سے دو چار کرنے والے اصحاب سے ہٹ کر بھی دیکھ لیا کریں، اگر وسعت افلاک میں ''تکبیر مسلسل'' کا شوق واقعی دامنگیر ہے اور اگر خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کے مشغلے کو جاری رکھنا ہے تو آپ کی رضا ہے۔ بہرحال دونوں میں جو فرق ہے آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا نیز اقبالؔ کے اس شعر سے آپ سے زیادہ کون آگاہ ہوگا! ؎

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

بطور خلاصہ کلام ہم یہ عرض کریں گے کہ قرآن مجید میں بلاشبہ عذابوں کے متعدد تذکار ملتے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ جس فرد یا جس قوم پر بھی عذاب نازل ہوا ہے، خدا نے محض اپنی شان جلالی کے ظہور کے لئے نہیں نازل کیا بلکہ لوگوں کے اعمال و افعال کا وہ منطقی نتیجہ تھا۔ اسی کا عنوان ''قانون مکافات عمل'' ہے جو کبھی تعطل کا شکار ہوا ہے نہ ہوگا۔ یہ آفاقی ضابطہ ایسا ضابطہ ہے جو کسی کے ساتھ استثنائی معاملہ نہیں کرتا۔ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی جو بھی کرے گا، متعین عقوبت بھگتے گا۔

اس تناظر میں عذابوں کے سلسلے تا ہنوز جاری ہیں۔ چاہے وہ عذاب ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کے عذاب ہوں۔ چاہے وہ قحط، وباؤں، پھلوں اور پیداوار کے نقصانات، بارشوں سے محرومی وغیرہ کی صورت میں مسلط ہوں۔ چاہے وہ عذاب غربت، بھوک اور عدم سلامتی کے عفریت کی صورتوں

میں نافذ ہوں' بہرحال جہاں جس کی جتنی غلطی ہے' اس کی سزا بھی موجود ہے اور سزا کا عمل اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے جو دور تک یعنی آخرت تک بھی پیچھا کر سکتا ہے۔

باقی اللہ تعالیٰ نے پہلے کسی معصوم/ بے گناہ پر کبھی اپنا عذاب نازل کیا ہے نہ اس نے اب ایسا کرنا ہے۔ ہاں ۸۔اکتوبر کا زلزلہ قہر الٰہی ہرگز نہیں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس سانحے میں ہمارے لاکھوں بھائی بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ہمیں اس مشکل گھڑی میں ان کی بحالی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہئے کہ وہ بے قصور ہیں۔ اگر اس زیان کا کوئی ذمہ دار ہے تو وہ طبقہ ہے جو ملکی وسائل کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ ارباب بست وکشاد کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی عوام کو معاشی آسودگی دے' تعلیم اور صحت کا خیال رکھے اور ایسے آفاقی حوادث سے بچاؤ اور تحفظ کے لئے اسی طرح بہترین بندوبست کرے جیسا کہ باشعور اور ترقی یافتہ اقوام نے کر رکھا ہے۔ اگر وہ یہ فرض ادا کرنے سے معذور ہے تو اسے حکمرانی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جو ڈرائیور نشے کی حالت میں گاڑی چلا رہا ہو وہ بے شمار بے گناہوں کی زندگیوں کو ضائع کر سکتا ہے فلہٰذا بے گناہوں کی بھی یہ ڈیوٹی بنتی ہے کہ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے وہ جائزہ لے لیں کہیں ڈرائیور نشے میں بدمست تو نہیں ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی
Email:azureabbas@hotmail.com

مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا

بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے

قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق انسانی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہوتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات ان طبعی قوانین کے ماتحت نہیں ہوتی جن کے مطابق انسان کے جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش تو قوانین فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات کی پرورش اور بالیدگی جن قوانین کے مطابق ہوتی ہے، انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار مستقل، غیر متبدل اور ابدی ہوتی ہیں۔ ان مستقل اقدار کی پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے ترقی کر کے، انسانیت کی سطح پر آتا ہے اور جب کبھی بھی مستقل قدر اور طبعی زندگی کے تقاضوں میں تصادم واقع ہوتا ہے تو طبعی زندگی کے مفاد کو نظر انداز کر کے، مستقل اقدار پر عمل کرنے سے زندگی مزید ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ جان تک مستقل قدر کے تحفظ میں قربان کر دینی ہوتی ہے۔ ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا خود ایک مستقل قدر ہے۔ اہم ترین شے وہ معاشرہ ہے جسے انسان ان مستقل اقدار کے مطابق قائم کرتا ہے اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر نظام درست ہے اور مستقل اقدار پر قائم ہے تو اس کے اندر انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج برآمد کرتی ہیں اور اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر قائم ہو تو اس میں افراد کی نیکیاں باطل پر قائم کردہ نظام کے جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھوٹنے کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر انفرادی نیکیاں موجب ثواب بھی نہیں ہو سکتیں کفر درحقیقت نظام خداوندی یا دوسرے الفاظ میں مستقل اقدار پر قائم شدہ نظام کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ مومن کا فریضہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ مشکل حالات میں انفرادی طور پر ان اقدار پر عمل کرتا رہے اور نقصان برداشت کرتا رہے بلکہ مومن کا فرض اولیں یہ ہے کہ ان حالات کے خلاف جدوجہد کر کے، ان

مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرے کیونکہ اس کا قائم کرنا خود ایک ایسی قدر ہے کہ جس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کو تلاش کیا جائے جو مستقل اقدار پر ایمان رکھتے ہوں۔ ان رفقاء کی مدد سے قوت میں اضافہ ہوگا اسی لئے قرآن کریم کا حکم ہے کہ کونوا مع الصادقین (۹/۱۱۹)۔ اور وارکعو مع الراکین (۲/۴۳)۔ سچوں کے ساتھ رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں حضورﷺ نے اپنے ساتھ تمام سعید روحوں کو جمع کر لیا اور ان کی اور مدینہ منورہ کے انصار کی مدد سے حضورﷺ نے وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کیا۔ انسان نہ تو اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی براہ راست اطاعت کر سکتا ہے۔ یہ دونوں مہتم بالشان امور انبیاء کرام کی معرفت سرانجام پا سکتے ہیں۔ انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم بھی رسول کی معرفت حاصل ہوتا تھا اور اس کی اطاعت بھی رسول کی معرفت ہی ہو سکتی تھی۔ اللہ کے دیئے ہوئے نظام کو جب رسول نافذ کرتا تھا تو اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ وہ احکامات اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہوتے تھے اور چونکہ ان کا نفاذ رسول کرتا تھا' اس لئے اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول دونوں کی اطاعتیں بیک وقت ہو جاتی تھیں۔ رسول کے تشریف لے جانے کے بعد بھی اس نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ رسول کے بعد بھی اللہ و رسول کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی۔

قرآن کریم کا یہ ایک ایسا نظریہ ہے کہ اس پر صدر اول کے مسلمانوں نے عمل کر کے دنیا میں ترقی و عروج اور آخرت میں سرخروئی حاصل کی۔ لیکن افسوس کہ ملوکیت نے غلبہ حاصل کر لیا اور یہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ لیکن اللہ و رسول کی اطاعت تو مسلمانوں کا ایک ایسا نظریہ تھا کہ اس سے تو مسلمانوں کو کسی طرح بھی نہ تو بدظن کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس سے روکا جا سکتا تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ تو بہت آسان تھا کہ قرآن کریم سامنے موجود تھا اور اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت تھی۔ لیکن رسول کی اطاعت کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا حل سوائے اس کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے لئے حضورﷺ کی احادیث جمع کر کے' اس کے ذخیرے مہیا کئے جائیں اور ان ذخیرہ ہائے احادیث و روایات کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دیا جائے جس کسی نے بھی حضورﷺ کی طرف منسوب کر کے' کوئی روایت بیان کر دی' اس روایت کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے دیا گیا اور عملاً رسول کی اطاعت احادیث کی اطاعت ٹھہرا دی گئی' اور رسول کا ترجمہ عملاً حدیث ہو گیا۔ اسی طرح ملوکیت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ نظام کا تصور اور

اس کی اہمیت وضرورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ اوراس طرح ملوکیت نے اپنے آپ کو نہ صرف محفوظ کرلیا بلکہ وضعی احادیث کے ذریعے اپنا جواز بھی فراہم کر دیا۔

آج مسلمان جس حالت میں ہیں اوراس غرقاب سے نکلنا چاہتے ہیں اس کے لئے صرف وہی نسخہ کام آ سکتا ہے جوصدراول میں کام آیا تھااور جس پر عمل کر کے ان کو یہ عروج و اقتدار حاصل ہوا تھا۔یعنی وہ مستقل اقدار پر قائم شدہ نظام اور اس کی دل وجان سے اطاعت۔

انسانوں کے باہمی تنازعات ومناقشات کو وحی الٰہی (قرآن) کے ذریعے طے کرنے کا نام دین ہے اور ہر وہ دنیاوی کام جس کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے طے کر دیا جائے وہ دینی کام ہوجاتا ہے۔وما اختلفتم فیه من شئ فحکمه الی الله (۴۲/۱۰)۔اورتم جس معاملہ میں بھی اختلاف کرو'اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ یہ صورت اسی وقت ہوسکتی ہے جب کوئی ایسی اتھارٹی موجود ہو جو یہ فیصلے فوری طور پر کر سکے'اس لئے اس کے واسطے وحی (قرآن) کے علاوہ کسی زندہ شخصیت کی بھی ضرورت ہے۔اس لئے کہ اس میں اکیلی کتاب کافی نہیں ہوتی اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے۔ یہ مرکزی شخصیت اللہ کا رسول ہوتا تھا اوراس کے بعد اس کا جانشین ہوتا ہے' اوراسی جانشین (خلیفہ) کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔آج جب کہ وہ نظام باقی ہے اور نہ ہی رسول کا جانشین' تو ہم اللہ کی اطاعت سے بالکل محروم ہیں اورآج جولوگ قرآن اور روایات پر عمل کر کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہیں تو یہ بھی ایک 'حدیث بے خبراں' ہی ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس نظام کی معرفت ہوتی ہے' وہاں اس کے وعدے بھی اس نظام کی معرفت ہی پورے ہوتے ہیں۔ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داری' انسانی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ دو آیات خداوندی اور دو احادیث نبوی اس مضمون کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ارشاد ہوتا ہے:واذا قیل لهم انفقوا مما رزقکم الله قال الذین کفرو للذین آمنوا انطعم من لو یشاء الله اطعمه ان انتم الا فی ضلل مبین (۳۶/۴۷)۔جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو یہ کفار ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ بھلا ہم اس شخص کو کھلائیں جسے خدا چاہتا تو اس کو خود کھلاتا' تم لوگ بس صریحی گمراہی میں ہو۔

کفار مسلمانوں سے کہتے تھے ہم ایسے لوگوں کے رزق کا انتظام کیوں کریں کہ اگر خدا چاہتا تو ان کے رزق کا انتظام خود کر دیتا۔اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو

کہ تم کھلی گمراہی میں ہو۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے اس قسم کا عقیدہ کہ خدا براہ راست رزق دیتا ہے کفار کا پیدا کردہ اور سخت گمراہ کن ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا رزق کا انتظام اپنے نظام کی معرفت کرتا ہے۔ یہ تمام انتظام خود انسانوں کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لیتا ہے جو خدا کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور اس کے عوض میں افراد معاشرہ وہ تمام فرائض ادا کرتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کیا ہوا ہوتا ہے۔ افراد معاشرہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک پابند ہوتے ہیں جب تک یہ نظام ان کی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔

(۲) نحن نرزقهم و ایاکم (۱۷/۳۲)۔ ہم تمہارے اور تمہاری اولاد دونوں کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ یہ آیہ کریمہ ہر وقت ہمارے پیش نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے رزق کا ذمہ دار ہے لیکن ہمارا سب کا روز کا مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں آدمی بھوکے مر رہے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ ایک ایک قحط میں ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں۔ اس سے لوگوں کو شک ہوتا ہے (اور بجا ہوتا ہے) کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کس طرح کا ہے کہ جو ہمارے سامنے ہی پورا نہیں ہوتا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے ہی نہیں کہ اللہ اس ذمہ داری کو براہ راست پوری کر کے، ہر شخص کو براہ راست رزق مہیا کرے۔ یہ ذمہ داری اور اس طرح کی تمام ذمہ داریاں اس کے نظام کی معرفت پوری ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ آیۂ کریمہ وما من دابة فی الارض الا علی الله رزقها (۱۱/۶)۔ زمین میں کوئی چلنے والا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں ہوتی۔ یہ ذمہ داری اس نظام کے سر ہوگی جو خدا کے قانون کے مطابق مستقل اقدار کی اساس پر قائم ہوگا۔

یہ بات کہ انسانوں کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے وعدے انسانوں کے ہاتھوں ہی اسلامی نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں، اس کے لئے متعدد آیات کریمات قرآن کریم میں موجود ہیں اور سلسلہ وار پیش بھی کی جا سکتی ہیں اور جن سے اسلامی نظام کے لازمی و لابدی ہونے پر دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں مزید ایک ہی آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مکہ شریف سے جب بیشتر مسلمان ہجرت کر کے مدینہ شریف آ گئے تو وہاں مکہ میں چند معذور، مجبور، بے کس و ناتواں مسلمان رہ گئے تھے جو مجبوری کے باعث ہجرت نہیں کر سکے۔ کفار ان مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم توڑ رہے تھے۔ مکہ کے وہ مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں وہاں سے نکال لے، کیونکہ وہاں کے رہنے والے بڑے ظالم تھے۔ ان مسلمانوں کی دعا کے جواب میں ارشاد ہوا کہ وما

لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ الخ (۴/۷۵)۔ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان کمزور اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے واسطے جہاد نہیں کرتے جو خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اور تو خود ہی کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنا دے۔ غور فرمائیں کہ مکہ کے مسلمان تو اللہ سے دعا کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ مدینہ شریف کے مسلمانوں کو یہ کہہ رہا تھا کہ تم مکہ کے مسلمانوں کی مدد کو فوری پہنچو، چنانچہ مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ کے مسلمانوں کی مدد کر کے ان کو وہاں سے نکالا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو اس طرح اپنے نظام کی معرفت پورا کیا۔ براہ راست ان کی مدد کر کے نظام کو نظر انداز نہیں کیا۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے معاملات میں مداخلت (Intervene) کرتا ہی نہیں۔

اسی سلسلہ میں حضورﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات کو بھوکا رہا اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا لیتا ہے، نیز حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اس طرح حضورﷺ نے اور حضرت عمرؓ نے واضح کیا کہ اللہ کے رزق پہنچانے کی ذمہ داری اسلامی نظام کے سر ہوتی ہے۔ ورنہ وہ دجلہ کے کنارے بھوک سے مر جانے والے کتے کے متعلق نہایت آسانی سے کہہ دیتے کہ جب تک وہ کتا زندہ رہا اللہ نے اس کو رزق دیا۔ جب اس کی موت آ گئی تو اللہ نے اس کا رزق بند کر دیا۔

انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس کی کتاب، اور اس کے نظام کے ذریعے ہی قائم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا کوئی اور تصور ذہن انسانی میں آ ہی نہیں سکتا Legal Parlance میں بات ذرا زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ہم انسانوں کی Duty ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے نظام کی اطاعت کریں اور یہ ہمارا Right ہے کہ وہ نظام اللہ تعالیٰ کے کئے ہوئے تمام وعدے پورے کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا Right ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں۔ وہ ہمارا خالق و آقا ہے۔ وہ ذاتِ بزرگ و برتر ہے لیکن اس نے خود ہی اپنے اوپر ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں۔ و کتب علی نفسہ رحمۃ (۶/۱۲)۔ اس نے اپنی ذات پر مہربانی لازم کر لی ہے، نیز ارشاد ہوتا ہے و کتب ربکم علی نفسہ رحمۃ (۶/۵۴)۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ اس لئے اس کی یا اس کے نظام کی Duty ہے کہ وہ اپنے وعدے پورے کرے۔ حضورﷺ کی حدیث کہ جس بستی میں کوئی بھوکا مر گیا، اس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت

مرفوع ہوگئی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا نظام اپنی Duty پوری نہ کرے تو اس کا Right بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف اس کے عطا کردہ نظام کی معرفت ہوتی ہے یہ نظام کوئی تصوراتی یا تخیلاتی (Utopia) نہیں ہوتا۔ یہ اس دنیا میں قائم شدہ اور متشکل کردہ ہوتا ہے۔ ایک زندہ اتھارٹی اس کے احکامات نافذ کرتی ہے مومنین پہلے ان کے احکامات کو سنتے ہیں ور پھر اس کے بعد ان احکامات کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس نظام میں اطاعت سے پیشتر 'سماعت' شرط ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا و الیک المصیر۔ (۲/۲۸۵)۔

اور کہنے لگے اے پروردگار ہم نے سنا اور ہم نے اس کی اطاعت کی۔

(۲) یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ' ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون۔ (۸/۲۰)۔

اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو۔

نیز آیات نمبر ۵۱/۲۴' ۶۴/۱۶' ۷/۵' اس بارے میں ملاحظہ ہوں۔

اس زندہ نظام کے ارکان وہی تھے جن پر ہم آج بھی عمل کرتے ہیں۔ وہ ارکان اس وقت نتیجہ مرتب کر رہے تھے۔ لیکن آج وہی ارکان محض رسوم بن کے رہ گئے ہیں اور کوئی نتیجہ ان کا برآمد نہیں ہو رہا ہے اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم ان سے اللہ کی اطاعت کر رہے ہیں لیکن چونکہ ہم ان کو قرآن کریم کے مطابق اجتماعی طور پر نظام کے ماتحت ادا نہیں کر رہے ہیں' اس لئے ان کے نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں۔

الصلوٰۃ کے لئے قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر (۲۹/۴۵)۔ صلوٰۃ فحشا و منکر سے روکتی ہے۔ یعنی بے شک نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے۔ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اول تو تمام مسلمانِ معاشرہ ورنہ کم سے کم نمازی صاحبان ہر قسم کی برائیوں' بے حیائیوں سے دور رہیں اور ان سے اس قسم کی حرکات سرزد نہ ہوں۔ یہ تو ایک سلبی پہلو تھا اس کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ جب اذان میں بہ بانگ دہل کہا جاتا ہے کہ حی علی الصلوٰۃ' صلوٰۃ کی طرف آؤ' اور فوری طور پر اس کی تشریح کر دی جاتی ہے کہ حی علی الفلاح' آؤ کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف۔ یعنی یہ کہ مومنین جو صلوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ برائیوں سے تو دور رہتے ہی ہیں۔ انہیں کامیابیاں اور کامرانیاں بھی حاصل ہوتی ہیں جب کہ خود قرآن نے قد افلح المومنون ۱/۲۳ بھی فرمایا ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ الصلوٰۃ کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ ہر طرح کی برائیوں سے محفوظ ہوگا اور کامیابی و کامرانی ہر نمازی کا مقدر ہوگا۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ یہ رکن بغیر نظام کے قیام کے ادا کیا جا رہا ہے۔ قرآن نے تو صلوٰۃ کے لئے شرط قرار دی ہے کہ صلوٰۃ حضورﷺ کی موجودگی میں صرف ان کے پیچھے ادا کی جائے گی۔ حضور کی موجودگی میں اگر کوئی شخص انفرادی صلوٰۃ ادا کرے گا تو اس کی صلوٰۃ قرآنی صلوٰۃ نہیں ہو سکتی (۴/۱۰۲)۔ صلوٰۃ خوف کے ضمن میں واضح طور پر اس بات کی تشریح کر دی گئی ہے کہ فوج کے مختلف حصے حضور کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے۔ فوج کے دستوں کے افراد صرف ایک مرتبہ صلوٰۃ ادا کریں گے، لیکن حضور دو مرتبہ صلوٰۃ ادا کریں گے تاکہ دونوں دستے ان کے پیچھے صلوٰۃ ادا کریں۔ حضور کی اقتداء کے بغیر اقامت صلوٰۃ کا کوئی تصور نہیں تھا حضور کی وفات کے بعد اسلامی نظام کے سربراہ کے پیچھے یا اس نظام کے مقامی منتظم کے پیچھے صلوٰۃ کا قیام ممکن ہے۔ سربراہ مملکتِ قرآنی کے مقرر کردہ امام کی اقتداء کے بغیر صلوٰۃ کا قیام درست نہیں ہے۔ یہ جو ہم نمازیں ''پڑھتے'' ہیں یہ تو مذہب کی نماز ہے۔ دین کی اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہے دین کی اقامتِ صلوٰۃ کے نتائج برآمد ہونے لازمی و لابدی ہیں۔ قرآنی صلوٰۃ کا واضح معیار اس کی محک و میزان (Criteria) یہ ہے کہ وہ تمکن فی الارض اور اقتدار مطلق ہونے کے بعد قائم ہو سکتی ہے، مغلوب و محکوم تو اقامتِ صلوٰۃ کر ہی نہیں سکتا' (۲۲/۴۱) نیز ارشاد ہوتا ہے کہ اقیم الصلوٰۃ لذکری (۲۰/۱۴)۔ نظام صلوٰۃ قائم کرو تاکہ اس میں میرا قانون نافذ ہو۔

ارکانِ اسلام میں دوسرا رکن صوم ہے۔ قرآن کریم نے اس کی جو غرض بتائی ہے وہ لتکبروا اللہ علی ماھداکم (۲/۱۸۵) ہے' تاکہ تم دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ کبریائی کے معنے حکومت و اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو فرعون نے ان سے کہا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو تو میں اس کا مدعا و مقصد خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں یعنی یہ کہ تکون لکما الکبریاء فی الارض (۱۰/۷۸)۔ تمہارا مطمحِ نگاہ یہ ہے کہ اس ملک میں تمہاری حکومت قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے۔ قرآن کریم نے یہاں کبریائی کا مفہوم خود واضح کر دیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل و کبرہ تکبیرا (۱۱۱/۷)۔ نہ سلطنت میں اس کا کوئی ساجھی ہے نہ اسے کسی طرح کی کمزوری ہے کہ کوئی اس کا سرپرست ہے' لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو۔ اس آیت کریمہ میں کبرہ کی توضیح لم یکن لہ شریک فی الملک سے خود کرائی

ہے۔لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی آسانی سے‘وعظ وارشاد تقاریر و مواعظ حسنہ سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اکھیڑ کر اس کی جگہ نظام خداوندی قائم کرنا ہے‘ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت اس کی سخت مخالفت کرے گی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا ان تمام مخالفتوں اور مقابلوں کے لئے میدان جنگ میں بھی جانا ہوگا چنانچہ قرآن کریم نے ان جنگوں کی غایت یہ بتائی ہے وجعل کلمة الذین کفروا السفلی و کلمة الله هی العلیاء (۹/۴۰)۔اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام عملاً غالب ہو جائے۔اس زمانے میں مستقل فوج Standing Army کا دستور شروع نہیں ہوا تھا۔قرآنِ کریم نے تمام مومنین کو مجاہدین قرار دیا تھا۔ خدا کی کبریائی کا تمکن ہر مومن مجاہد کا فریضہ تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ روزوں سے ضبطِ نفس اور سختی برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت میں صلابت آتی ہے۔مشکلات وتکالیف برداشت کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا اور نظام باقی نہیں رہا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ لتکبروا الله علی ماهداکم‘ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے‘ تو باقی رہے لیکن ان کا مفہوم بدل گیا۔اب ہمارے ہاں قرآن کریم کے تراجم میں اس کا ترجمہ ’’تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو‘‘ کیا جاتا ہے۔یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا مذہب میں اس کا مفہوم خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا ہے۔’’کبریائی قائم کرنے‘‘ اور ’’بڑائی بیان کرنے‘‘ میں جو فرق ہے وہ آپ سب کے پیش نظر ہے اور اس کی تعمیل نماز عید میں چھ(۶) زائد تکبیریں کہنے سے کی جاتی ہے۔کبریائی کا قیام ایک حقیقت تھی اور زائد تکبیریں ادا کرنا ایک رسم ہے۔

حج کا اجتماع بھی دین کے مقاصد کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہی ایک اہم رکن ہے اور یہ دین کے نظام کا ایک بنیادی ستون ہے۔فتح مکہ سے پیشتر کعبہ شریف کیونکہ مشرکین کے قبضہ میں تھا۔اس لئے وہاں قرآنی حج کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ فتح مکہ کے بعد ۸ ہجری کا حج تو سابقہ دستور کے مطابق ہی ہوا۔ ہاں البتہ ۹ ہجری میں حج کو قرآنی شکل دے دی گئی۔حضورﷺ خود مصروفیات کی بناء پر اس حج کے لئے تشریف نہیں لے جا سکے۔لیکن حضرت ابوبکرؓ کو اسلامی مملکت کے نمائندے کی حیثیت سے حجاج کا سربراہ مقرر فرما کر بھیجا۔اس حج میں بیشتر سابقہ رسوم ومناسک کو برقرار رکھا گیا‘ لیکن حج کے اجتماع کو خلاف قرآن اور مشرکانہ رسوم سے پاک وصاف کر دیا گیا۔۱۰ ہجری کے حج میں حضورﷺ خود بنفس نفیس تشریف لے گئے اور اس حج کے موقع پر حضور نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر

انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی کی حیثیت رکھتا ہے۔اس خطبہ کا ملخص یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ رنگ، نسل، خون، زبان، وطن، قومیت، ذات پات، برادری، قبائل، ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر انسانوں کی عالم گیر برادری تشکیل دی جائے۔خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی یہ اجتماع ان ہی مقاصد عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن کریم نے خود متعین فرما دیا تھا۔مملکت کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ان کے علاوہ وہ لوگ بھی آتے تھے جو حکومت کے احکام کے خلاف شکایات پیش کرنا چاہتے تھے چونکہ دور دراز کے عمال حکومت آتے تھے، اس لئے عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔اس کے بعد منیٰ میں ۳ روز قیام کر کے باہمی مشورہ جات ہوتے تھے اور آئندہ سال کے پروگرام طے کئے جاتے تھے۔سربراہ مملکت یا اس کا نمائندہ ان فیصلہ جات اور دیگر امور کا اعلان کرتا۔شکایات کا ازالہ بھی اسی روز کیا جاتا اور یہ سب کچھ دلائل و براہین کی رو سے کیا جاتا۔ان فیصلوں اور تجاویز کو ساتھ لے کر، یہ نمائندگان، اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس آ جاتے۔

ان مذکورہ بالا ارکان کے علاوہ بھی جو بنیادی تصورات اور اعمال ہمارے ہاں دین میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے، ان کو مذہب کی سطح پر لا کر بالکل بے معنی و بے مقصد کر دیا گیا ہے۔ان کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں مذہب میں تعلق باللہ پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور اس سے مراد نمازیں، روزے، نفلی نمازیں اور روزمرہ کی عبادات خیال کی جاتی ہیں کہ ان عبادات کے ذریعے انسان کا اللہ سے انفرادی طور پر تعلق قائم ہو جاتا ہے۔اور اسی کو مقصدِ حیات بھی خیال کیا جاتا ہے۔لیکن دین میں اس طرح کا تعلق خدا سے قائم ہو ہی نہیں سکتا۔دین میں تو اللہ سے تعلق صرف قرآن کے نظام کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے۔جب ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔کیونکہ قرآن کریم کے مخاطب ہم ہی ہیں۔خدا سے ہمکلام ہونے کی کسی کی خصوصیت نہیں ہے۔اس میں مومن اور غیر مومن سب ہی شامل ہو سکتے ہیں کیونکہ اس میں 'الناس' سے تخاطب کیا گیا ہے۔البتہ جب ہم اس نظام پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں تو ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔یہ کھلے بندوں قائم ہوتا ہے۔اس میں کوئی سر مکتوم نہیں ہے۔ہر فرد خود یہ تعلق قائم کرتا ہے۔دوسروں کو کرا سکتا ہے۔خود اس پر عمل کرتا ہے دوسروں سے اس پر عمل کراتا ہے۔اس طرح تعلق باللہ کے نتائج دنیا کے سامنے آتے ہیں اور صدر اول میں اسی طرح یہ نتائج دنیا کے سامنے آئے۔یہ نظام کے ذریعے تعلق باللہ کی صورت ہے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔اس کے علاوہ اور کسی تعلق کا پتہ قرآن کریم سے نہیں ملتا۔

تہجد کا لفظ بھی ہمارے ہاں خوب mis-use کیا

جاتا ہے۔تہجد کے لغوی معنے سونا اور جاگنا دونوں ہوتے ہیں۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ یہ قرآن کریم میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے جہاں کہا گیا ہے ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک (۷۹/۱۷)۔ رات کے کچھ حصہ میں اس قرآن کے ساتھ (بہ) جاگو یہ صرف تمہارے لئے خاص ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ قم اللیل الا قلیلاً (۷۳/۲)۔ رات کو قیام کرمگر تھوڑے حصہ کو چھوڑ کر۔ قرآنی انقلاب کے اولیں مراحل میں پروگرام اس قدر سخت' جانکاہ اور مشقت طلب ہوتا ہے کہ اس میں دن کے علاوہ راتوں کو بھی کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رات کو جاگنے کا یہ حکم جیسا کہ آیۂ کریمہ میں نافلۃ لک کے الفاظ سے ظاہر کردیا گیا ہے صرف حضورﷺ کے لئے تھا۔ امتی اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ حضور کو دن میں بہت کام ہوتا تھا۔ ان لک فی النہار سبحاً ۷۳/۷ دن میں تمہارے لئے اور بہت کام ہیں اس بناء پر حضور کو حکم تھا کہ آپ رات کو قرآن کے ساتھ (بہ) جاگیں۔ اس میں غور وفکر کر کے سکیمیں بنائیں اور دن میں ان کو عملی جامہ پہنائیں ان کو (Implement) کر دیں لیکن مذہب میں اس کا ترجمہ نماز پڑھنا کیا گیا ہے ''اور رات کے ایک خاص حصہ میں نماز تہجد پڑھا کرو'' (ترجمہ حضرت مولانا فرمان علی صاحب)۔ تفسیر شہیر تدبر قرآن میں مرقوم ہے ''اور شب میں بھی تہجد پڑھو یہ تمہارے لئے مزید برآں ہے''۔ غرض دین کے قیام کے لئے غور وفکر اور عملی کوشش کو ''مذہب'' میں نماز میں منتقل کردیا گیا۔

''نذر اللہ اور نیاز حسین''۔ عام طور پر مستعمل ہے۔ نیاز فارسی لفظ ہے اور اس اعتبار سے اس کا قرآن کریم یا دینی تصورات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ البتہ نذر عربی لفظ ہے۔ اس کی جمع نذور آتی ہے۔ یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یوفون بالنذر ۷۶/۷' یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں یعنی واجبات۔ یہ وہ امور ہیں جو مومنین اپنے اوپر از خود واجب قرار دے لیں (اور پھر ان کو پورا کریں)۔ مثلاً آپ کے گاؤں میں لڑکوں کا سکول تو موجود ہے لیکن لڑکیوں کا کوئی سکول نہیں۔ اور وہاں لڑکیوں کے سکول کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے' لیکن حکومت کے پاس اس کے لئے پورے فنڈز نہیں ہیں تو گاؤں کے لوگ اس کے لئے ۶۰ فیصد رقم Offer کرتے ہیں اور ۴۰ فیصد رقم حکومت کو مہیا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ یہ ۶۰ فیصد رقم کا ادا کرنا دینی اور قرآنی اصطلاح میں نذر ہے۔ لیکن مذہب میں اس سے شبرات اور بائیس رجب کے کونڈے مراد ہوتی ہے جو جگہ جگہ لوگ کھاتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس بچوں کے لئے کپڑے سلوانے یا ان کی فیس ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے لیکن وہ یہ نذر کے کونڈے یا بیوی کی صحنک بڑے اہتمام سے کرتے ہیں اور جس قدر روپیہ اس میں خرچ ہوتا ہے وہ مذہب کے نام

پر ضائع ہوتا ہے۔

صدقہ' ہر وہ چیز جو خدا کی راہ میں دی جائے صدقہ ہے۔ زکوٰۃ کا دینا واجب ہوتا ہے۔ لیکن صدقہ دینا واجب نہیں ہوتا' بلکہ تطوعاً دیا جاتا ہے۔ جب قرآنی نظام اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے' سب معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہوتا ہے۔ لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معیّن رقم افراد پر واجب کرتا ہے' جو عام حالات میں وصول کی جاتی ہے' اس کے لئے زکوٰۃ کا لفظ بطور اصطلاح آیا ہے۔ لیکن ہنگامی حالات میں جو کچھ مومنین دیتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے حکم یہی ہے کہ صدقات (عطیات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو۔ پھر اس مرکز نظام یعنی حضورﷺ سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو ۹/۱۰۳۔ اور اس رقم کو معاشرہ کے فلاحی کاموں کے لئے ان مدات پر صرف کرو جن کا ذکر سورہ توبہ میں آیۂ کریمہ ۹/۶۰ میں آیا ہے یہ صدقات کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں غلطی سے زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے اور بار بار انتباہ کے باوجود ہمارے علماء کرام ان کو زکوٰۃ کے مصارف ہی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ شروع میں جو مفسرین نے ان کو زکوٰۃ کے مصارف بیان کر دیا ہے۔

''مذہب'' میں صدقہ کسی مصیبت کو ٹالنے یا اس سے محفوظ ہونے کو کہتے ہیں۔ سفر پر جب جہاز میں جانا ہوتا ہے تو اہل خانہ تھوڑی سی دال' کچھ آٹا اور تیل کا صدقہ اتارتے ہیں تاکہ جہاز بمع مسافروں کے بخیریت پہنچ جائے۔ نیا مکان تعمیر کرنے سے پیشتر کئی بکروں کو صدقہ کے طور پر ذبح کرتے ہیں۔ یہ دستور اس درجہ رواج پذیر ہوا کہ اب تو صدقے کے بکرے الگ فروخت ہونے لگے ہیں۔ ببیں تفاوت راہ از کجا ست تا بکجاست۔

کسی مجرد حقیقت یا نظریہ کی محسوس علامات Symbols' شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ مثلاً مملکت کا جھنڈا' شعائر کی حیثیت سے وہ بڑا واجب الاحترام ہوتا ہے' لیکن اس کے کپڑے یا بانس کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ وہ کپڑا پرانا ہو جائے یا وہ بانس گل سڑ جائے' تو ان کی دوسرے کپڑوں یا دوسرے بانسوں سے کوئی تمیز نہیں۔ شعائر اللہ سے مراد اس مملکت کی محسوس علامات ہیں جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہوتی ہے' اسلامی حکومت کی کرنسی Currency' جوڈیشل پیپرز' پاسپورٹ' ویزا Stamps Visa' یہ سب شعائر اللہ ہیں۔ ان کو صرف Recognise کیا جائے گا وہ بھی اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر فی ذاتہٖ کوئی تقدس نہیں رکھتے۔ ان کا احترام قوانین خداوندی کے احترام کا ایک محسوس طریقہ ہے۔ لیکن ''مذہب'' میں مزعومہ

نذر و نیاز، علَم، تعزیہ، ذوالجناح یہ سب شعائر اللہ ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے بیعت ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ خدا مومنین سے ان کے جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ صرف ذہنی یا اعتقادی نہیں ہوتا کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا مال و جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا اور خدا نے آپ کو جنت دے دی۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں نظام خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے حضورﷺ نے متشکل فرمایا تھا اور جسے حضور کے بعد آپ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور ہمیشہ مستحکم رہنا تھا' اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے اور اخروی زندگی میں بھی یہی وعدہ پورا کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد مومنین اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی کی ضروریات کی طرف سے بے فکر ہو جاتے ہیں اور نظام خداوندی کے استحکام کی خاطر عندالضرورت جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو قتل کر کے فاتح و منصور واپس آ جاتے ہیں اور یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں اور مرنے کے بعد جنت کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں ۹/۱۱۱۔ یہی وہ بیعت تھی جو جماعت مومنین نے حدیبیہ کے مقام پر کی تھی اور جس کا ذکر سورہ فتح میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ ان الذین یبا یعونک انما یبایعون اللہ یداللہ فوق ایدیھم ۴۸/۱۰۔ جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے معاہدہ کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پر (بظاہر تمہارا ہاتھ لیکن درحقیقت) اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو معاہدہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے اس کی عملی شکل کیا ہوتی ہے۔ یعنی وہ معاہدہ اس نظام کے مرکز کے ساتھ کیا جاتا ہے جو قوانین خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ بیعت جو جان و مال یعنی سب کچھ دے کر جنت لینے کے لئے کی جاتی ہے۔ لیکن جب مرکز ہی نہیں رہا اور دین مذہب میں بدل گیا تو اس وقت بیعت' جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے' پیر کی بیعت کرنا مراد لی جانے لگی۔

اسی طرح قرآن کریم کے بیسیوں الفاظ ہیں جن کا مفہوم دین میں کچھ اور تھا اور دین کے منقرض ہونے کے بعد مذہب میں ان کا مفہوم بالکل مختلف ہو گیا۔ ان میں سے' توبہ' استغفار' تسبیح' ملائکہ' روح' وسیلہ' اسی طرح اور بے شمار الفاظ ہیں۔

سنت الٰہی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی' ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً (۳۳/۶۲)۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا علم ہوتا ہے جس کی وضاحت اس نے سورۃ حج کی اس آیت کریمہ میں فرمائی ہے۔ وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی التی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطٰن ثم یحکم اللہ آیتہ

(۲۲/۵۲) اور ہم نے تجھ سے پیشتر جس نبی اور رسول کو بھیجا تو اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کے جانے کے بعد شیطان (دین سے منحرف لوگ) اس کی کتاب میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے' اس کے لئے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو ان تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی اصلی اور منزہ شکل میں پیش کر دیتا۔

آیہ مبارکہ کے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف رسول مبعوث فرمائے۔ ایک رسول آتا وہ اپنی مردہ قوم کو زندہ کرتا۔ دین کے زندگی بخش نظریات ان کو دیتا اور ان پر عمل پیرا ہونے سے اس کی قوم زندگی کی خوشگواریاں حاصل کر لیتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہوتا تھا' جو ان کو یہ خوشگواریاں عنایت فرماتا۔ اس میں نہ انسانوں کی حکمرانی ہوتی اور نہ ہی لوگوں کی کسی طرح کی بھی Exploitation۔ اس میں نہ سرمایہ داری ہوتی نہ اس میں پیشوائیت' اس معزز نبی کے چلے جانے کے بعد یہ قوم کچھ عرصہ اس پر مسلسل عمل کرتی رہتی' یہاں تک کہ امتداد زمانہ سے اس نبی کی تعلیم میں آمیزش ہو جاتی اور اس کی قوم اس کے دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتی۔ اور وہ قوم پستی و زوال کے گڑھے میں جا گرتی۔ پھر رحمت الٰہی اپنی تدبیر کے مطابق ایک دوسرا (نیا) نبی مبعوث فرماتی جو لوگوں کو صحیح دین کی تعلیم دیتا۔ معاشرہ کے پست ترین لوگ' اور اس معاشرہ کی سعید روحیں اس نبی کا ساتھ دیتیں اور مفاد پرست لوگ اس نبی کی مخالفت کرتے اور کہتے کہ آپ کونسی ایسی چیز لائے ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم بھی خدا کو مانتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ نیا رسول سخت محنت و جانفشانی کے بعد منزہ وحی کے مطابق پھر معاشرہ کو مستقل اقدار کے مطابق قائم کرتا۔ اور یہ قوم پھر مردہ سے زندہ ہو جاتی۔ وحی کی حیات آور تعلیم اور اس کی عطا کردہ مستقل اقدار' اس کو بلندیوں کی معراج پر پہنچا دیتیں' پھر کچھ عرصہ بعد اس قوم کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوتا جو گذشتہ اقوام کے ساتھ ہوا تھا۔ یعنی وحی میں آمیزش ہوتی' اس کی قوم دین کو مذہب میں تبدیل کر کے' غیر خداوندی نظام قائم کر لیتی۔ اس تبدل و تحول میں عمدہ ترین مثال حضورﷺ کی دعوت کی ہے۔ اعلان نبوت کے بعد آپ کی شدید ترین مخالفت ہوئی۔ چھوٹی بڑی بیاسی (۸۲) لڑائیاں مخالفین کے ساتھ ہوئیں اور بالآخر حضور نے دین کو عملی طور پر مستقل اقدار کے مطابق متشکل فرما دیا۔ صدر اول کے مسلمانوں نے نہایت عروج و اقتدار حاصل کیا۔ دین کا اتباع کرنے کی وجہ سے حضورﷺ' اس جماعت مومنین کو' بہترین قوم بنا کے' تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے دین پھر مذہب میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ چونکہ سرمایہ داری اور پیشوائیت ملوکیت کے ساتھ تھی اس وجہ سے مذہب کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی' اور مستقل اقدار اور دین کا

تصور آہستہ آہستہ بالکل ختم کر دیا گیا۔

آج مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ صورت ہیں حالم میرس۔ تعلیم یافتہ طبقہ جو Intellegentia کہلاتا ہے۔ وہ کم وبیش اسلام کے مستقبل سے بالکل مایوس ہے۔ یہ موجودہ حالات کے تقاضے ہیں۔ مسلمان خود بھی اپنے خود ساختہ نظامہائے باطل سے مایوس ہو کر' اسلامی نظام کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی غیر مترقبہ Opportunity ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں Miss نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن افسوس کہ جو سبب ہمارے زوال وادبار کا ہے۔ ہم پھر اسی سبب کو اپنا علاج سمجھ کے اختیار کر رہے ہیں۔ تمام مسلم ممالک میں پھر دین کے بجائے مذہب کا احیاء ہو رہا ہے۔ ایران وافغانستان میں مذہب کا احیاء کیا گیا' جو دونوں جگہ ناکام رہا۔ ہمارے ہاں بھی گورنمنٹ کی طرف سے بڑے بڑے ادارے بنائے گئے ہیں' بے شمار روپیہ ان پر صرف ہو رہا ہے۔ مذہبی عدالتیں بنائی گئیں۔ زکوٰۃ' عشر' اوقاف' وزارت مذہبی امور' ٹی وی کے ہر چینل پر مذہب کی تبلیغ میں مسابقت' یہ سب مذہب کا احیاء ہے اور مزید زوال وادبار کا باعث' اس کا دین سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہائے افسوس' صد ہزار افسوس کہ آج پوری اسلامی دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو دین ومذہب کے فرق کو نمایاں وواضح کر کے' دین کی قیام کی تحریک کو لے کر اٹھے اور کسی خطۂ ارض پر دین (مستقل اقدار) کو قائم کر کے مسلمانوں کو اس گرداب سے نکال لے' کیونکہ مسلمانوں کا عروج وزوال تو صرف ان کے دین کے عروج و زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ خوب یاد رکھیں کہ اگر آج کہیں مذہب کی اساس پر اسلامی حکومت قائم بھی ہو جائے تو وہ صرف کچھ عرصہ ہی چل سکے گی اور لازماً کچھ مدت بعد منقرض ہو جائے گی۔ مذہب میں وہ اساس محکم ہے ہی نہیں جس پر حکومت قائم ہو سکے۔ مذہب نہ اس کا داعی ہے اور نہ ہی اس کا متقاضی۔ مذہب کے نام پر قائم کردہ اسلامی حکومت کے ناکام ہو جانے کے بعد' یاد رکھیں' کہ پھر مسلمانوں کو کم سے کم ہزار سال تک اسلامی حکومت قائم کرنے کی ہمت نہیں ہوگی اور یہ مسلمانوں کے لئے بڑی ہی تباہی وبربادی کی بات ہوگی۔

خدا کی کتاب محفوظ شکل میں موجود ہے۔ یہ تمام اقوام عالم کے لئے یکساں آئین حیات ہے۔ اگر مسلمان مذہب کو بدل کے دین اختیار نہیں کریں گے تو کوئی اور قوم قرآن کے نظام کو اختیار کر لے گی یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دین خداوندی ہر حال میں غالب آ کر رہے گا۔ (۹/۳۳) مگر افسوس کے: تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے۔

فستذکرون ما اقول لکم (۴۰/۴۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آفتاب عروج، چنیوٹ

اہل تشیع کی تکفیر کا مسئلہ

ماہنامہ الشریعہ شمارہ مئی ۲۰۰۵ء میں محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کا مضمون بعنوان ''شیعہ سنی تنازع اور اس کا پائیدار حل'' نظر نواز ہوا۔ سب سے پہلے تو میں محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب کی خدمت اقدس میں سلام پیش کرنا چاہوں گا کہ فرقہ واریت کے اس لرزہ خیز اور بھیانک دور میں اور بذات خود بھی ایک فرقہ سے متعلق ہو کر ان کے نہاں خانہ دل میں ''اتحاد بین المسلمین'' کے تصور کا پیدا ہونا ہی ایک بہت بڑی قلب ماہیت ہے۔ اس کی جس قدر بھی ستائش کی جائے، کم ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائیں، ان کی حفاظت فرمائیں۔ میری مسلم امہ سے مایوسی کی تاریک سرنگ میں روشنی کی ایک معمولی سی کرن نظر آئی تو اب فرقہ واریت کی اس تاریک سرنگ کے اس پار محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کی شکل میں روشنی کی دوسری کرن بھی نمودار ہوئی ہے۔ گو کہ ان ہلکی سی معمولی دو کرنوں سے فرقہ واریت کے گھپ اندھیروں میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا، لیکن روشنی بہرحال روشنی ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں روشنی ہوگی، وہاں اندھیرا نہیں رہے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب مل کر اپنے اپنے طور پر وحی الٰہی قرآن کے نور (النساء ۱۷۵) کے دیے روشن کرتے چلے جائیں تو اندھیرا خود بخود چھٹ جائے گا اور تمام عالم میں ہر سو اجالا ہو کر رہے گا۔

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب نے مذکورہ مسئلہ کے پائیدار حل کے لئے کچھ تجاویز تحریر فرمائی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''غیر مسلمین کے بارے میں سخت شرعی احکام کے پیش نظر احتیاط و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فتویٰ یہ دیا جائے کہ جس شخص کے یہ اور یہ عقائد ہوں، وہ کافر ہیں۔ یہ نہ کہا جائے کہ سارے شیعہ کافر ہیں''۔ اس عاجز کم علم قاری کی محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اپنی اس تجویز کو مزید وسعت دیں، اس لئے کہ اس تجویز سے یہ التباس پیدا ہوتا ہے کہ صرف شیعہ کمیونٹی میں سے کچھ گروپ یا گروہ ایسے ہیں جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں، باقی تمام فرقوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، وہ تمام پکے اور مستند مسلمان ہیں، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دوسرے فرقوں کے خلاف بھی فتوے جاری ہوتے رہے

ہیں اور ہوتے رہتے ہیں اور اب ان فتاویٰ کی رو سے کوئی بھی فرقہ مسلمان نہیں رہا اور یہ فتاویٰ کوئی ہما شما قسم کے اشخاص نے نہیں دے رکھے' بلکہ مکہ و مدینہ کے علماء کے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ منگوائے جاتے رہے ہیں۔ یہ عاجز کم علم ڈاکٹر محمد امین صاحب سے عرض گزار ہے کہ آپ کی پیش کردہ تجاویز کو اس طرح وسعت دی جائے کہ جس شخص کے یہ اور یہ عقائد ہوں' وہ کافر ہے۔ اس میں کسی مخصوص فرقہ کی بات نہ ہو اور وہ فتویٰ تمام مسالک کے علماء کرام کا متفق علیہ ہو اور اس پر تمام مسالک کے علماء کے دستخط ہوں اور وہ فتویٰ کسی حکومتی ادارہ یا بینک میں محفوظ کر دیا جائے اور اس کی نقل تمام اخبارات و جرائد میں شائع کی جائے اور تمام ٹی وی چینلز اور ریڈیو اسٹیشنز سے اس طرح بار بار نشر ہوتا رہے جس طرح حکومت تمباکو نوشی کے خلاف اشتہار نشر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا جو کوئی بھی شخص کسی بھی فرد یا گروہ کے خلاف فتویٰ جاری کرے' اس کے خلاف انضباطی کارروائی کا کوئی مستقل ادارہ قائم کر دیا جائے۔ بصورت دیگر وہ مقاصد ہرگز حاصل نہ ہو سکیں گے جو مولانا زاہد الراشدی صاحب اور محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب اپنی آرزوؤں میں رکھتے ہیں۔

ہر شخص پر اپنے اپنے فرقہ اور مذہب کی گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ اس پر اپنے فرقہ سے الگ ہونے کے تصور سے ہی کپکپی طاری ہونے لگتی ہے۔ وہ ایک ان دیکھے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میرے محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب جیسی صاحب علم اور مدبر شخصیت کو بھی صراحت کرنی پڑ گئی۔ وہ فرماتے ہیں' ''التباس سے بچنے کی خاطر ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ ذاتی طور پر ہمارا عقیدہ وہی ہے جو جمہور اہل سنت کا.....'' میں یہاں شاید سوء ادب کا مرتکب گردانا جاؤں کہ اس عاجز' کم علم کے مطابق اللہ جل شانہ نے اپنی ہدایت و تعلیمات کے ذریعے انسانوں کے لئے جو ضابطہ زندگی عملاً اختیار کرنے کو دیا ہے' اسے اسلام کہا ہے: ''اور آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا ہے''۔ (مائدہ ۳) اور جو لوگ اس دین (ضابطہ حیات) کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں' انہیں مسلم (مسلمان) کہا ہے۔ (الانبیاء ۱۰۸۔ یونس ۷۲) اور نبی اکرم ﷺ نے اپنا تعارف مسلم (مسلمین) کہہ کر کروایا ہے۔ (الانعام ۱۶۴) تو یہ بیچ میں جمہور اہل سنت یا جمہور اہل تشیع کہاں سے آ گئے؟ کیا جمہور یا کسی گروہ یا کسی شخصیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ وحی الٰہی قرآن کے رکھے گئے نام و اصطلاحات و احکامات کو تبدیل کر دیں یا اپنی نسبت یا اپنا تعارف کسی دوسرے نام سے کرائیں؟ کیا نبی اکرم ﷺ سنی یا شیعہ تھے؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سنی یا شیعہ تھے یا حضرت علیؓ شیعہ تھے؟ ہرگز ہرگز ایسا نہیں تھا۔ وہ سنی تھے نہ شیعہ۔ وہ فقط مسلم تھے' مومن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا تعارف

ان الفاظ میں کرایا ہے: ''محمد خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں رحم دل۔'' (الفتح ۲۹) صحابہ کرام کے کردار کے متعلق اس آیت میں جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے، وہ صحیح و مستند اور لاریب ہے یا صحابہ کرام کے کردار کا وہ رخ جو تاریخ ہمیں دکھاتی ہے، وہ معتبر ہے؟

اسی آیہ مبارکہ میں صحابہ کرامؓ کو کھیتی کے بیج سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اگر تاریخ کے مطابق جو اس نے ہمیں بتایا ہے، بیج ہی ناقص ہو تو زمین سے نہ کونپل پھوٹے گی، نہ نال مضبوط ہوگی، نہ کھیتی والے خوش ہوں گے۔ نہ کافروں کا جی جلتا، نہ اسلام پھلتا پھولتا۔ دراصل یہ سارا قصہ ہماری تاریخ کا ہے جس پر وحی الٰہی سے زیادہ ہمارا ایمان ہے اور تاریخ ہمیشہ ظنی ہوتی ہے۔ ''اور ان میں سے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور کچھ شک نہیں کہ ظن، حق کے مقابلے میں کچھ بھی کارآمد نہیں ہوسکتا''۔ (یونس ۳۶) اس کے ثبوت کے لئے ماہنامہ الشریعہ ماہ مئی اور جولائی کے شماروں میں محترمہ پروفیسر شاہدہ قاضی اور محترم شاہ نواز فاروقی کی تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہماری تاریخ انہی محترم حضرات کی چپقلشوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے نہ جانے کتنے افسانوں کو ہمارے سامنے حقیقت کے روپ میں پیش کر کے ہمارے ایمان کا جزو اول بنا رکھا ہے۔ شیعہ سنی تنازع بھی ایک افسانہ تھا جو حقیقت بن کر اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والوں میں موجب فساد بن کر ہزاروں لاکھوں کروڑوں بے گناہ انسانوں کی جانیں لے چکا ہے اور اب بھی لے رہا ہے۔ دشمنان دین اسلام کی سازشوں اور کارستانیوں اور ہمارے علماء کرام کی انتہائی سادگی کے سبب اعلیٰ و ارفع سچے دین کے پیروکاروں کو فرقہ واریت کی اس آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں بچایا تھا۔ ''اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تمہیں بچالیا''۔ (الانفال ۶۵)۔

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کا یہ تجزیہ صحیح ہے کہ حکومتی انتظامیہ اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے دینی عناصر سے متعلق لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اپنا رکھی ہے، لیکن میرے محترم، یہ تو میکیاولی کی سیاست ہے جسے جمہوریت کہتے ہیں اور یہ حربے اور طور طریقے جمہوریت کا مرکزی نظریہ اور اس کی اساس ہیں۔ سیاست دانوں کی حد تک تو میکیاولی سیاست کا یہ حربہ یا طریقہ شاید قابل قبول ہو، لیکن دینی علماء اس میکیاولی سیاست کا حصہ بننے پر کیوں بضد ہیں، جبکہ یہ کبھی بھی ان کا فریضہ نہیں رہا۔ ان کا اصل فریضہ اور غایت الغایات تعمیر سیرت و کردار اور انسان سازی ہے۔ (سورۃ البقرہ ۱۲۹،

۱۵۱)۔لیکن یہ حضرات تزکیہ نفس یعنی تعمیر سیرت و کردار کو ترک کر کے سیاست دانوں کی تقلید میں مفاد عاجلہ کی خاطر حصول اقتدار کے لئے میکیاولی سیاست کے گند میں کیوں کود پڑے اور اپنے مقام و مرتبہ' اپنے وقار اور احترام کو خاک میں ملا کر بیٹھے؟ انہیں چاہئے تھا کہ سیاست و اقتدار کے بجائے امت میں موجود فرقہ واریت کو ختم کرتے' قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرتے اور افراد معاشرہ کی اصلاح اور تعمیر سیرت و کردار کے لئے (جو اس وقت ناپید ہے) جدوجہد کرتے۔اس کے لئے اگر جان کی قربانی بھی دینی پڑتی تو اس سے دریغ نہ کیا جاتا۔

اس وقت میرے سامنے' جنوری ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی اکیس علماء کرام کے منظور کردہ بائیس نکات پر مشتمل دستخط شدہ متفقہ قرارداد کی کاپی ہے جس میں حکومت وقت سے ملک میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔اس قرارداد کی شق نمبر۴ میں یہ الفاظ درج ہیں:

''اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا بندوبست کرے''۔

شق نمبر۹ کے الفاظ ہیں:

''مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی ہوگی''۔

یعنی ملک کے اکتیس جید علماء کرام متفق ہوئے ہیں فرقہ واریت پر جس کو اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دے رکھا ہے۔

۱۹۵۳ء میں (ہندو مسلم نہیں) مرزائیوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان فسادات کروائے گئے۔سینکڑوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ پہلا مارشل لا متعارف ہوا جس کا باعث مذہب تھا۔حکومت نے اس قضیہ کو مٹانے کی خاطر ایک خصوصی عدالت تشکیل دی جس کے سربراہ جسٹس منیر تھے۔اس عدالت نے تمام علماء کرام سے استدعا کی تھی کہ وہ عدالت کی راہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ مسلم کی تعریف (Definition) کیا ہے۔اس کے جواب میں کسی بھی ایک عالم نے دوٹوک جواب نہیں دیا۔جن علماء حضرات نے جواب داخل کروائے' ان کا جواب کسی بھی دوسرے عالم سے نہیں ملتا تھا۔نتیجتاً جو فیصلہ دیا گیا' اس کے الفاظ یہ تھے:

''ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں' پیش نظر رکھ کر ہماری طرف سے کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے' بجز اس کے کہ دین کے دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں؟ اگر ہم اپنی طرف سے مسلم کی کوئی Definition کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے گا۔اگر ہم علماء میں سے کسی ایک کی تعریف

اختیار کرلیں تو اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے' لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔'' (حوالہ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات پنجاب' ص ۲۳۵' ۱۹۵۳)۔

جنرل ضیاء الحق نے نفاذ اسلام کے شوق میں ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ ۲۲۷ میں وضاحتی نوٹ کے نام پر ترمیم کر کے فرقہ واریت کو دوام دے کر مختلف فرقوں کے درمیان محاذ آرائی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اب اگر علماء کرام خلوص نیت سے فرقہ واریت کا خاتمہ کر کے اتحاد بین المسلمین اور مملکت خداداد پاکستان میں نفاذ اسلام چاہتے ہیں تو اپنی لیڈرشپ متحدہ مجلس عمل سے مطالبہ کریں کہ وہ صوبہ سرحد میں جہاں ان کو اقتدار حاصل ہے' ضیاء الحق کے دور میں آئین کی دفعہ ۲۲۷ میں وضاحتی نوٹ کے نام پر کی گئی ترمیم کو منسوخ کرانے کے لئے سرحد اسمبلی سے ایک قرارداد منظور کرائیں جس طرح حسبہ بل اسمبلی سے منظور کروایا تھا۔ اس کے بعد قومی اسمبلی میں بھی اس ترمیم کو منسوخ کرانے کے لئے بل پیش کریں جو فوراً منظور ہو جائے گا۔ یہیں سے ہماری نیتوں کا پتہ چل جائے گا کہ یہ جو نفاذ شریعت' نظام مصطفیٰ کے نعرے گزشتہ ساٹھ سال سے فضا میں گونجتے رہے ہیں' ان میں کتنی صداقت ہے اور کتنی سیاست۔ یہ اس لئے کہ فرقہ واریت کو ختم کئے بغیر اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں۔ یہ بات قرآن میں لکھ دی گئی ہے۔ ''جو اللہ تعالیٰ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دیں' تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں' فاسق ہیں۔'' (مائدہ ۴۴' ۴۵' ۴۷) باقی جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

ان تلخ حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس عاجز کم علم کی رائے یہ ہے کہ یہ شریعت بل' نفاذ شریعت کونسلیں اور حسبہ بل سب بے کار و بے معنی ہیں' جب تک ملک میں دین کے حوالے سے فکری و نظریاتی ہم آہنگی نہ ہو۔ فرقہ واریت اتحاد ملی کے لئے زہر قاتل ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس نے مسلم امہ میں عموماً اور پاکستانی معاشرہ میں خصوصاً ایک ناسور کی شکل اختیار کر رکھی ہے جس میں سے ہر وقت زہریلا مواد بہتا رہتا ہے۔ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو ہمارا مذہبی و معاشرتی جسم اس کی لپیٹ میں آ کر گل سڑ جائے گا اور ہماری موت واقع ہو جائے گی۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے فرقہ واریت کی خلیج کو پاٹا جائے۔ میرے ممدوح جناب محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب اور جناب محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب تمام مسالک کے علماء کرام سے رابطہ کریں اور کسی مقام پر مسلمان کی تعریف کے ایک نکاتی ایجنڈے پر سیمینار منعقد کروائیں اور اس میں تمام مسالک کے علماء کرام کے علاوہ دیگر صاحبان علم و قلم' دانشوروں' سیاست دانوں کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیں۔ علماء کرام کو دین سے محبت ہے اور اب وہ بہت

سے سرد و گرم حالات سے گزر چکے ہیں اور گزر رہے ہیں۔ اب انہیں معروضی حالات اور زمینی حقائق کا ادراک حاصل ہو چکا ہوگا اور وہ یقیناً مسلم کی تعریف کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے بعد شیعہ سنی اور دیگر تمام تنازعات خود بخود ختم ہو جائیں گے' لیکن اس کے لئے محکم اساس کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ مجھ کم علم' عاجز کے نزدیک یہ اساس محکم قرآن کریم کے علاوہ کہیں اور سے نہیں مل سکتی اور وہ یہ ہے: ''اے رسول! جس نے امت کے اندر فرقہ بنایا' تو ان میں سے نہیں''۔ (انعام ۱۶۰' الروم ۳۱۔۳۲)۔

میری حضرت مولانا زاہد الراشدی اور ڈاکٹر محمد امین صاحب کے علاوہ دیگر تمام مسالک کے علماء کرام سے دست بستہ التجا ہے کہ وہ قرآن کریم کی ان آیات پر غور و تدبر فرمائیں اور انہیں اس مسئلہ میں بنیاد بنائیں۔ ہم کب تک باہمی ضد کی وجہ سے منتشر اور بھٹکتے پھرتے رہیں گے اور اسلام دشمن قوتوں کا ایک ایک کر کے نوالہ بنتے چلے جائیں گے؟ اس عاجز کم علم کی تمام مذہبی و سیاسی قیادت' اہل علم و قلم اور ملک کے تمام دانشوروں سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ اٹھیں اور آگے بڑھ کر جس قدر جلد ممکن ہو' اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں مولانا زاہد الراشدی اور ڈاکٹر محمد امین صاحب کی مساعی جمیلہ میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ گو کہ یہ مسائل صدیوں پر محیط ہیں لیکن خلوص نیت' جذبہ صادق اور اللہ اور اس کے نبی آخر الزماں ﷺ سے محبت ہو تو کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک نہ ایک دن ہم اپنے ہاتھوں سے لگائی ہوئی آگ پر قابو پانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ' بابت اکتوبر ۲۰۰۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

مسئلہ جنات

(آخری قسط)

اس میں کلام نہیں کہ بعض اوقات ایسی امثلہ بھی مل جاتی ہیں کہ نائرہ صفت' شرارہ خیز' پرکالۂ آتش' آذرفشاں اور احساس برتری کی نار سے تپیدہ وسوزاں 'جنات' کا جب کسی مامور من اللہ کی شخصیت اور تعلیمات سے آمنا سامنا ہوتا ہے تو ایک غیر معمولی اور غیر متوقع تغیر برپا ہونے لگ جاتا ہے۔ یعنی ذات میں ترازو دوسرے امکان کے امکانات بیدار ہو جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ صحیح خطوط پر سفر کرنے لگ جاتی ہے۔ دل پر پڑے ہوئے تکبر اور تعصب کے کثیف پردے ایک ایک کر کے اترنا شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔ خلیفہ ثانی شہکار رسالت سیدنا حضرت عمر فاروقؓ اس سلسلہ کی اہم ترین مثال ہیں۔ پیغام رسالت کی شدید نوعیت کی توانائی ان کے دل پر اثر کر گئی۔ پھر رسولؐ خدا کی اپنی Dynamic شخصیت کا جلال و جمال کچھ ایسا مؤثر ثابت ہوا کہ وہی انتہا پسند عمر جو تحریک اسلامی کے ایسے سخت مخالف تھے کہ کیا کوئی Hard Task Master ہوگا۔ اب ان کی فہم جاگ چکی تھی' جذبات کی آگ پر ہوش و خرد کی خنک پھوار پڑ چکی تھی۔ وہ ماضی کا Violent اور Militant اب ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ دین اسلام کا فہیم' دانا' متوازن' صاحبِ فراست فرد کھڑا تھا جس کا ہاتھ اب اپنے ہیرو محمد ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ جی ہاں یہ ایک ''تحول'' تھا۔ ناری طبع کے نوری طبع میں تبدیل ہو جانے کی اس سے بڑی نظیر یقیناً تلاش کرنے سے بھی نہیں ملے گی۔ 'جِنّ' سے 'جَن' بننے کی اس سے زیادہ حسین مثال واقعی فراہم نہیں کی جا سکتی۔

عجب للجن و لطه بها
وشد العيس بانتا بها
تهوى الى مكة تبغى الهدى
ماصادق الجن ككذبها
وارحل الى لصفوة من هاشم
ليس قد اما كانا فابها
وارحل الى الصفوة من هاشم
بين رواجيها و اهجارها
عجبت الجن و تحاسها
واشدها لعيس باحلاسها

☆ میں جِنّوں کے دور دراز سفر کے لئے بوریا بستر باندھنے پر تعجب کر رہا ہوں۔

☆ اگر تم ہدایت کے طلبگار ہو تو مکہ معظّمہ کی طرف جلدی چلو اور یاد رکھو سچا جن جھوٹے جن کی طرح نا قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔

☆ جا جلدی جا اور ایک بار بنو ہاشم کے اس چہرۂ جمیل کو دیکھ تو سہی ویسا جمال تو نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

☆ بنو ہاشم کے عظیم صفت اللہ کے منتخب نبی ﷺ کی زیارت سے اپنا دل روشن کر لے۔

☆ میں حیران ہوں میری جنات برادری جلد سے جلد مکہ مکرمہ جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ ایک ایک اپنے اونٹوں کے کجاوے کسے نظر آتا ہے اگر تو عقل مند ہے ہدایت چاہتا ہے تو اٹھ جلدی کر۔

عہد رسالت کے کسی سچے ''جن'' کی مذکورہ خوبصورت نعت سن کر من بے طرح پکار اٹھا ہے: ؎

اب ''جن'' کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اسی طرح ایک اور برگزیدہ صحابی گزرے ہیں جن کا اسمِ گرامی حضرت عمرؓ ہے۔ کہا جاتا ہے یہ بھی قوم جنات کے فرد تھے۔ انہوں نے بھی آپ ﷺ کی بارگاہ میں عسلِ مصفیٰ ایسے پاکیزہ جذبات کا نہایت دلنشیں پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اس جاہلی دور کے بادیہ نشین (جنات) بھی آج کے دور کے مہذب انسانوں سے لاکھ درجہ بہتر تھے کہ صحراؤں کی جھلسا دینے والی تمازتوں میں مقیم ہونے کے باوصف ان کی روحوں میں نخلستان آباد تھے۔۔۔ لیکن کسی پتھر سے اگنے والا یہ گلاب درحقیقت آپ ﷺ ہی کی حسین ذات کا اعجاز ہے۔ کسی اکھڑ اور درشت بدو کی زبان سے عرفان کے اس چشمے کا جاری ہو جانا معمولی واقعہ نہیں۔ یہ ''جن'' شاعر جنابِ عمرؓ ہماری نگاہ میں اپنے دور کے ہی نہیں آئندہ زمانوں کے لاتعداد انسانوں سے بھی افضل ہیں۔ ذرا یہ عجیب نعتیہ اشعار پڑھئے اور دیکھئے کیسے آپ کی روح وجد کر اٹھتی ہے:

(1)

فتعد ودع ذکرا لھم
بل کیف و انت بھم نصب

(2)

وارحل قلصاً یقد من علی
رء وف فتزاح بہ الکرب

(3)

فالخلق الیہ جما عتھم
تحدٰی بھم فسح نجب

(4)

لززلغز نشز نھز
جمز حضز ضمر شزب

(5)

شنخ رخخ مخخ دخخ

فتخ شمخ جرخ هلب

(6)

هشش خشش عشش فشش

خدش عمش برش عتب

(7)

بعع کنع وقع صمع

قطع کمع طمع الب

(8)

فانخ بنبی الٰه الخلق

اتت بفضائله الکتب

(9)

لنبی هذٰی و نسیج تقیٰ

فبذاك تدین له العرب

(10)

بمحمدن المبعوث وذی الخیرات

منازله الرحب

(11)

والحوض له الرکن معاً

والبیت و مکة والحجب

(12)

نصراً هزم الاحزاب له

فتمام صنائعه الرغب

(13)

فهدیت فانت جلوت عماً

واضاء بذاك لنا السبب

(14)

والیک محمد انبعثت

جون باخشتها ثببوا

(15)

والیک رحلت مغاق اولی

کتبٍ و معاشر قد دهبوا

(16)

لتجود علی فتعطینی

بشرائع لیس لها ثلب

(17)

فالله هداك و انت هدیت

فدل لملتک النصب

(18)

فصلوٰة الٰه الخلق علیک

وجاد فملکت السکب

(1) ہٹو اور ان اونٹنیوں اور اونٹنی والوں کا ذکر چھوڑو۔ اے دل! تجھے کیا ہو گیا تو کیوں ان کے مارے دکھی ہے۔

(2) تو اپنی اونٹنیوں کو کوچ کے لئے ہانک' تاکہ وہ اس دلبر دلنواز کے قدموں میں جا پہنچیں وہ جس کے ذریعہ سب دکھ درد مٹ جاتے ہیں۔

(3) تمام مخلوق کے لوگ گروہ گروہ جس کی طرف چلے جا رہے ہیں اور ایسی اونٹنیوں کی حدی پڑھتے ہوئے لئے جاتے ہیں جو چوڑے سینے والی اور منتخب ہیں۔

(4) وہ اونٹنیاں جن کا سینہ گوشت سے بھرا ہوا ہے چوہے کے بلوں کے مانند پیچیدہ راستہ کو وہ آسانی طے کر رہی ہیں۔ فربہ اور قوی ہیں' جوشِ رفتار میں گویا سینہ کے بل چلی جا رہی ہیں' بہت جلد جلد قدم اٹھاتی ہیں' مجسم رفتار ہیں' وہ اس پہاڑ کی مانند ہیں جو گرد و غبار سے صاف ہو' تازہ شاخ کی مانند بارونق ہیں۔

(5) قدآور ہیں' مضبوط ہیں' قوت سے بھری ہوئی ہیں' سیاہ اور بھوری ہیں خشم ناک ہیں' بلند قد ہیں' سیلاب رواں ہیں' بڑے بڑے بال والی ہیں۔

(6) ہشاش بشاش ہیں' نکیل اور خورجیوں والی ہیں' جلد باز ہیں' دودھ دوہی ہوئی ہیں' چلنے میں زمین کے اندر خراش پیدا کرنے والی ہیں' کسی سہارے کی محتاج نہیں ہیں' رنگا رنگ ہیں' سراپا ناز ہیں۔

(7) جہاز کے مانند سامان سے بھری ہوئی چلی جا رہی ہیں' ستارے کی طرح غروب ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہیں' جنگ آزمودہ ہیں' چھوٹے کان والی ہیں' جلد جلد مسافت طے کرنے والی ہیں' سفر کی بہت ہی شائق ہیں' ہمہ تن رفتار ہیں۔

(8) ٹھہر ٹھہر اَے مسافر! ٹھہر قافلہ کے اونٹوں کو بٹھا دے اور پیغمبر خداوند عالم کی خدمت میں حاضر ہو' جس کے فضائل میں بہت سی کتابیں آئی ہیں۔

(9) وہ جو ہدایت کرنے والا نبی ہے' جس کا جامہ وجود سراسر تقویٰ کے تاروں سے بنا ہوا ہے جبھی تو سارا عرب اس کے دین کا جان نثار اور اس کے نام کا فدا کار ہے۔

(10) وہ محمد (ﷺ) جو خدا کی طرف سے مبعوث ہے تمام خوبیوں کا مالک ہے' جس کے مراتب و مدارج نہایت ہی بلند اور وسیع ہیں۔

(11) حوضِ کوثر بھی اس کا ہے مکہ' رکن و مقامِ کعبہ اور اس کے پردے ان سب کا وہی مالک ہے۔

☆☆☆

بشریتِ انبیاء

سابقہ امم وملل کے غلطی خوردہ احبار و رہبان اور ان کے نادان متبعین کی طرح دورِ حاضر کے بعض علماء اور عوام بھی یہ مذہبی عقیدہ (Doctrine) رکھتے ہیں کہ انبیاء و رسل ذریت انسانی سے نہیں بلکہ کوئی مافوق الفطرت چیز ہوتے ہیں۔ قرآن

اس نظریے کو درست تسلیم نہیں کرتا' اور بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے مامورین آتے ہی اس وقت رہے ہیں جب عامتہ الناس کے اذہان کی تحتانی سطح (Grass Root Level) تک ایسے معتقدات اتر جاتے ہیں۔

قدیم سے جاری سنت الٰہیہ کے مطابق اصولِ استبدال و استخلافِ اقوام (Principle of Succession & Substitution of Nations.) ایک بار پھر حرکت میں آتا رہا ہے اور ایک نیا مامور' ایک نئی تجلی' ایک نئی قوت نافذہ اور ایک نئی دنیا کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا رہا ہے۔ گویا ''نفخِ روح خداوندی'' سے پھر ایک نئے آدم کی تخلیق و تکمیل ہوتی رہی ہے اور جب وعلم اٰدم الاسماء کلھا کے مطابق ناموں کا علم آدم کو ملتا تھا تو اسی آدم کا سفر بشریت سے نبوت تک وحی سرمدی کی روشنی میں طے ہونے لگتا تھا۔ یعنی اس کا فائض النور' مستنیر اور شفاف سینہ غوامض قدسیہ' تجلیات الٰہیہ اور مخدرات مقدسہ کے پیہم نزول کا مہبط بن جاتا تھا۔ یاد رہے یہ پورا عمل الوہیاتی توانائی (Divine Energy) سے انجام پاتا ہے۔ جس کی' تفہیم سے عوام کالانعام کے اذہان وقلوب قاصر ہوتے ہیں اس لئے کہ ان کا لفظ پرست درک (Verbalism) پارینہ قصۂ آدم پر تو ایقان رکھتا ہے لیکن اپنے سامنے وجود میں آنے والے آدم کے عملِ تخلیق پر ایمان نہیں لاتا۔ شاید انہیں یہ احساس ستاتا ہے کہ یہ بشر ہوتے ہوئے آدم بن گیا اور ہم اس سے ''بہتر بشر'' ہونے کے باوجود ''منکرِ عظمتِ آدم'' ٹھہرائے گئے۔ مذہبی پیشوائیت کا یہی پندارِ تفوق انکارِ آدم کا اہم ترین سبب ہوتا ہے۔ یہ احساس امتدادِ زمانہ کے بعد جب ایک نئی سنتان میں منتقل ہوتا ہے تو وہ غالباً غایت درجہ فروتنی اختیار کرتے ہوئے اس عقیدہ میں پناہ لے لیتے ہیں کہ انبیاء کو 'فوق البشر' ہونا چاہئے۔ غالباً وہ اپنے آپ کو اور اپنی اردگرد سوسائٹی میں پھیلے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر 'انسانیت' کی تعریف وضع کرتے ہیں۔ کم نصیب یہ نہیں کہتے کہ ہم انسان نہیں' بنی انسان ہیں' بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم انسان ہیں بنی انسان نہیں۔

تاریخِ مذاہبِ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ امر بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ انبیاء کی بشریت سے انکار کوئی نیا عقیدہ نہیں بلکہ ہر دور کے نبی پر یہ اعتراض لازماً وارد ہوا کہ تم تو ہم جیسے انسان ہو' تم نبی کیسے ہو گئے؟

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۵/۳۶)۔

لیکن انہوں نے کہہ دیا کہ تم تو ہماری طرح انسان ہو۔ (نیز ۱۰/۶۱۴/۶۴)۔

فَقَالُوْا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا .....(۲۳/۴۷)۔

انہوں نے کہا کیا ہم ان کی بات مان لیں جو انسان ہونے کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے ہیں۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۲۳/۲۱)۔
یہ تو تمہاری ہی طرح کا ایک عام انسان ہے۔
فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (۱۱/۲۷)۔
اس پر اس کی قوم کے بڑے بڑے لوگوں۔۔۔ (جنہوں) نے انکار وسرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے یہ کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو؟)۔
مَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۲۶/۱۵۴)۔
تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے تم خدا کے رسول کس طرح ہو سکتے ہو؟)۔
وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا .....(۲۶/۱۸۶)۔
تو ہماری ہی طرح کا انسان ہے (اس لئے تو خدا کا رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟)۔

یہ ایک عجیب توارد ہے کہ حقیقتِ نبوت سے ناآشنا افراد افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں کہ عقل کو آلۂ ابلیس قرار دینے والے ''عشاق'' نے اگر کسی کی رسالت کا اقرار کیا ہے تو اس کی بشریت کا انکار کر دیا ہے۔ برتری اور الحاد (Atheism) کی گود میں گرے ہوئے افراد نے اگر کسی رسول کی بشریت کا اقرار کر لیا ہے تو اسکی رسالت کا انکار کر دیا ہے۔ ہاں جو صاحبانِ شعور تھے انہوں نے انبیاء کو ذریتِ انسانی سے خارج نہیں کیا۔ نہ ہی ان سے معجزات کا مطالبہ کیا ہے' بلکہ ان کے انقلاب آفریں پیغام' حیات نو سے معمور تعلیم' باعمل و باکردار شخصیت اور بے داغ سیرت کو دیکھا' پرکھا اور پھر کامل غور وفکر' تدبر وتفحص کے بعد یعنی علیٰ وجہ البصیرت اسے دعویٔ ماموریت میں صادق جانا اور پھر اس کے پیش کردہ نظام (خداوندی) کے خود کو تابع کر دیا۔۔۔ ان معتدل مزاج سابقون الاولون میں سب سے غیر معمولی شخص جو ہمیں نظر آتا ہے وہ پیارا امامِ ہمام سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ ہے کہ جب حضرت اقدس ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہؓ کی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں بشریتِ انبیاء کا اعلان فرمایا تھا:

من كان يعبد الله فان الله حيى لا يموت۔ ومن كان منكم يعبد محمد فان محمداً قد مات۔

''اے لوگو! جو تم میں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا' اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر کبھی موت وارد نہیں ہو سکتی اور جو کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو اس کو میں بتا دیتا ہوں کہ محمدؐ فوت ہو چکے ہیں''۔

اگر بالفرض انبیاء کو غیر انسان سمجھیں تو پھر ان کی حیثیت چٹھی رساں سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ جو وحی خدا تعالیٰ نے ان پر نازل کی ہے وہ صرف بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے ہے۔ کلامِ الٰہی کی آگہی بشر کے لئے ہے، غیر بشر کے لئے نہیں۔ درآں حالیکہ صاحبِ وحی والہام، سب سے پہلے نازل ہونے والے آسمانی کلام پر ایمان لاتا ہے (**ان اتبع الا ما یوحی الی**) اور اسپر عمل کر کے سیرت و کردار کا اعلیٰ نمونہ بن کر دکھاتا ہے تاکہ لوگ اس 'مجسم وحی' کو Model یقین کر کے اپنی زندگیوں میں انقلابی تغیر پیدا کریں۔ اب اگر انبیاء غیر انسان تھے تو لامحالہ یہ وحی ان کے لئے نہیں تھی۔ اگر مامورین ربانی بشر نہیں تھے تو ان کا اس وحی پر عمل کرنا کسی کمال کا سبب نہیں۔ ہاں انسان ہوتے ہوئے اگر وہ اپنی حیاتی میں انقلابی تبدیلی پیدا کرتے تو بات بھی تھی اور پھر ایک انسان غیر انسان کو رول ماڈل کیسے یقین کر سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے ''تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے'' مگر رسولؐ ہمارے لئے نظیر اور نمونہ کیسے بن سکتے ہیں۔ رسولؐ کے نفحاتِ طیبات اور انفاسِ قدسیہ ہماری راہنمائی کا سبب کیسے بن سکتے ہیں؟ ان کی سنت ہمارے لئے کیونکر قابلِ تقلید اور لائقِ اتباع قرار پا سکتی ہے؟ آسمانی کلام کے پیش فرمودہ اصول و قواعد پر ہم کیسے عمل پیرا ہو سکتے ہیں؟ اگر صاحبِ وحی کا تعلق ہی نوعِ انسان سے نہیں۔۔ لیکن دیکھئے قرآن کس صراحت کے ساتھ اس موضوع کو بیان کرتا ہے:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۱۴/۱۱)۔

ان کے رسولوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں لیکن خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نبوت بطور موہبت عطا کر دیتا ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ إِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (۲۱/۷۔۸)۔

باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ یہ رسول ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے۔ سوائے رسول! ان سے کہہ دو کہ ہم نے اس سے پہلے بھی جو پیغمبر بھیجے تھے وہ آدمی ہی تھے۔ اگر تمہیں اس کا علم نہ ہو تو ان لوگوں سے دریافت کر لو جنہیں اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔ نہ تو ان رسولوں کے جسم ایسے بنائے گئے تھے کہ انہیں کھانے پینے کی ضرورت نہ ہو اور نہ ہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔ (وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے

اور پھر اپنے وقت پر وفات پا جاتے تھے۔ لہٰذا یہ تصور ہی غلط ہے کہ رسول کو عام انسانوں سے الگ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہونا چاہئے)۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَاحِدٌ .....(۴۱/۶)۔

ان سے کہو کہ تم ذرا میری پوزیشن کو سمجھ لو۔ سب سے پہلے تو یہ کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس لئے میرے طبیعی تقاضے کچھ تم سے مختلف نہیں۔ تم میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی آئی ہے کہ تمہارے لئے اقتدار و اختیار صرف خدائے واحد کا ہے۔

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۝ (۹۳/۱۷).

یا تیرے لئے ایک سونے کا محل تیار ہو جائے یا تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چڑھ جائے۔۔۔ اور صرف آسمان پر چڑھ ہی نہ جائے کیونکہ محض اتنی سی بات سے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ بلکہ۔۔ وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر اتار دے جسے ہم پڑھ کر دیکھ لیں کہ اسے واقعی خدا نے لکھا ہے۔

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ میرا نشو ونما دینے والا اس سے بہت بلند ہے کہ وہ تمہارے ایمان لانے کے لئے اس قسم کی باتیں کر دکھائے۔ باقی رہا میں خود تو میں نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ اس فرق کے ساتھ کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچاتا ہوں۔

انبیاء کی بشریت کے ثبوت کے لئے مزید دیکھیں: (۹۳/۶)، (۲۶/۷۴)، (۱۰۳/۱۶)، (۲۵/۵۴)، (۳۴۔۳۵/۲۱)، (۹۴۔۹۵/۱۷)، (۳۶/۳۱،۷۴)، (۷۸/۳)، (۳۳/۱۵)، (۱۸/۵) اور (۷۱/۳۸)۔

آیاتِ بینات، احادیث صحیحہ اور اربابِ دانش کے فکری سرمایہ سے یہ شہادت درجۂ تواتر سے گذر کر رتبۂ حق الیقین تک پہنچتی ہے کہ انبیاء و رسل بشر تھے، کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں تھے۔ دلائل و براہین کے وسیع و کثیر اثاثے کو دیکھ کر ہمارے بعض بھائی مذہبی جوش (Theo Pathy) میں فوراً یہ تاویل پیش کیا کرتے ہیں کہ انبیاء و آئمہ تھے غیر انسان لیکن مبعوث لبادۂ بشری میں ہوئے تھے۔ معروف مفسر قرآن محترم مولانا احمد یار صاحب گجراتی ''فلسفۂ بشریت'' پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''قل انما انا بشر مثلکم، اے محبوب فرما دو کہ میں تم جیسا بشر ہوں..... نیز اس آیت میں کفار

سے خطاب ہے' چونکہ ہر چیز اپنی غیر جنس سے نفرت کرتی ہے لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ اے کفار تم مجھ سے گھبراؤ نہیں میں تمہاری جنس سے ہوں یعنی بشر ہوں۔ شکاری' جانوروں کی سی آواز نکال کر شکار کرتا ہے''۔ (جاء الحق' ص ۱۷۵' ص ۱۷۶)۔

ذرا مقیاسِ تحقیق انیق اور معیارِ تفسیر پر غور کیجئے کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنے مخصوص عقیدہ کی وجہ سے نسلِ انسانی سے خارج کرنے کے لئے شکاری سے تشبیہہ دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اب شکاری کیا کرتا ہے؟ میرا قلم اجازت نہیں دیتا۔ آپ خود تدبر کر لیجئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت کرے۔

☆☆☆

پھر یہ کہ بشر کو تو تقاضائے بشری کے مطابق بھوک بھی لگتی ہے' وہ تھک بھی جاتا ہے' مقررہ اوقات میں سوتا بھی ہے' جذبات و حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے' طبعی ضرورت کے پیشِ نظر شادی بھی کرتا ہے' اولاد سے پیار بھی کرتا ہے' اپنے ماں باپ بہن بھائی اور معاشرے کے دکھ سکھ میں شریک بھی ہوتا ہے' ہنسنے کے وقت ہنستا ہے' رونے کے موقع پر روتا ہے اور اپنی حاجات خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ غرض ایک مخصوص نظام کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔۔۔ جب یہ ساری باتیں ہمیں انبیاء کرام کی مبارک زندگیوں میں نظر آتی ہیں تو اس کا مطلب ہوا (معاذ اللہ) وہ لوگ محض دکھاوے کے لئے یہ سب افعالِ بشری انجام دیتے تھے ورنہ حقیقتاً وہ ان لوازم سے بے نیاز تھے۔ جنگِ خندق کے موقع پر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر پیٹ پر پتھر باندھ لئے اور خود حضرتِ اقدسؐ نے دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔ اب بتایا جائے کہ اگر حضورؐ اشتہا سے بے نیاز تھے تو آپ کے اس عمل کے کیا معانی ہوں گے؟ آپ کو تو بسا اوقات فاقے بھی کرنا پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر ضعف کے آثار دیکھ کر صحابہؓ نے سمجھا کہ آپؐ کو بھوک لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک صحابیؓ نے بکری ذبح کی اور آپؐ کو اور بعض صحابہؓ کو کھانا کھلایا۔۔ آپؐ کے چہرہ پر ضعف کے آثار چہ معنی دارد؟ اس طرح جب آپ ﷺ مسلسل روزے رکھتے تھے تو ان کا کیا مطلب ہوا؟

ایک شخص ایسی خوبیاں لے کر پیدا ہوا ہے کہ اگر وہ کھانا نہ بھی کھائے تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے روزہ رکھ کر کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا' ایسے شخص کے روزے کی عملی صورت کیا بنے گی؟ آپؐ ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہتے تھے' پاؤں مبارک سوج جاتے اس کی کیا تاویل پیش کی جائے گی؟ طائف کی وادی میں جب آپؐ تبلیغی دورے پر گئے تو ظالموں نے پتھروں کی بارش برسا دی' نعلین مبارک میں خون جم گیا' کیا اس وقت بھی آپ کو تکلیف نہیں پہنچی؟ جنگِ احد میں دشمنوں نے آپؐ پر تیر برسائے۔ آپؐ کا دانت مبارک شہید ہو گیا' لوہے کے خود کی کڑیاں آپؐ کے سر میں چبھ گئیں اور خون جاری ہو گیا' بعض روایات کے مطابق آپؐ بیہوش ہو گئے اور خون جاری ہو گیا۔۔۔۔۔ یہ

سب کیا تھا؟ شعبِ ابی طالب میں آپؐ اور آپؐ کی جماعت مذہبی پیشوائیت کے جور و جبر کا جس طرح شکار ہوئی اور آپؐ جن جانکاہ مراحل سے گزرے آپ ﷺ کو دائرہ بشریت سے نکال دینے پر ان قربانیوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں حضور ﷺ کو جن واقعات سے شدید ذہنی اذیت ہوئی ان میں ایک مکرب واقعہ افک ہے۔ آپؐ اس قدر پریشان تھے کہ پکار اٹھے ''کوئی ہے جو مجھے اس شخص سے بچائے جو میرے گھر والوں کے بارے میں مجھے ایذا دیتا ہے''۔ کیا یہ انتہائی غمگین واندوہ گیں حالت آپؐ کی بشریت کا اعلان نہیں کر رہی؟ فتح خیبر کے موقع پر یہودی خاتون زینب بنت الحرث (اہلیہ سلم بن شکم) نے جب طے شدہ سازش کے تحت آپ کو زہریلا گوشت کھلانے کی کوشش کی تو آپؐ کے صحابیؓ براء بن معرورؓ جو اس دعوت میں شریک تھے وہ گوشت کھانے سے انقال کر گئے اور خود حضورؐ نے بھی تھوڑا سا حصہ اس کا چکھ لیا مگر جلد ہی تھوک دیا۔ پھر بھی اس سمومِ شدید کا اثر بہت دیر تک آپؐ کے جسم و جان پر رہا۔ حدیث کی مشہور کتاب ''بخاری'' میں لکھا ہے:

..... رسولِ خدا اپنے مرضِ وصال میں فرماتے' اے عائشہ! ہمیشہ میں اس کھانے کی تکلیف محسوس کرتا رہا جو میں نے خیبر میں کھایا تھا اور اب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس زہر نے میری رگِ جاں کو کاٹ دیا ہے۔ (جلد دوم' ص ۶۹۳)۔

کیا یہ سب ردِ عوامل عین انسانی نہیں ہیں؟۔۔۔؟ ستم تو یہ ہے کہ ہمارے بھائی آپؐ کے جسم ظاہری تک کے قائل نہیں مگر بات ہو واقعۂ معراج کی تو جسمانی معراج ثابت کرنے کے لئے جب تک تمام علمِ کلام صرف نہ کر دیں گے چین نہیں آئے گا۔

پیارے آقا و مولیٰ ابوالارامل' خاتم النبین حضور شہاب مبین ﷺ نے بشری تقاضوں کے باوجود اللہ کے نبی ہونے کی وجہ سے اپنی وہبی و اکتسابی صلاحیتوں سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس لئے باقی انسان بشر ہوں یا نہ ہوں' نبی اکرم ﷺ بشر تھے۔ بشرِ کامل تھے۔ سید البشر تھے استکمالِ آدمیت کے مظہر اتم تھے۔

QUALITY OF LIFE

By

Ubedur Rahman Arain

==========

If it is taken as fact that all of life is a struggle for survival then it is equally a struggle to survive in style. All of humanity strives instinctually to provide the best quality of life for itself and secure, if possible, even better for posterity. It matters not whether one is born in poverty or in the lap of luxury; the biological drive to succeed is imprinted in every infant. This imperative has no religion, knows no country boundaries, or ethnic bias. In fact, one can argue that all these factors are arbitrary, learned behaviors that in the end do not really deflect an individual from that basic need to improve his quality of life. He may use these factors to his advantage, but these things do not really sway him from subjectively obtaining his desires. Granted, as humans mature, the very substance of what one deems essential to quality of life, be it money, power, or fame to use three very obvious examples, can differ from person to person, but the attainment of one is also linked to the fulfillment of other areas in life. For example, no actor strives to be in multimillion dollar films only to live in a mud hut. Similarly, the president of even the most tiny speck in the ocean will work to expand his influence as wide as he possibly can, through the media or the business sector.

If you take an individual as a model for a whole nation, then it is obvious that the motivations of most nations is also to create the highest quality of life for its citizens, current and the future generations. And like individuals, while a nation may be shaped by various social, religious, and geographical factors, the policies governments make are still just as self serving and emotionally based as those of its populace when dealing with each other one on one. They may try to minimize the negative effects of their behavior on others, but in the end, as long as they get what they want, most people don't think beyond fulfilling their needs. As long as their quality of life is secure, no price is too high. So hundreds die in a bomb explosion because certain individuals are convinced violence against innocents will get them what they want. Developed countries dump industrial and electronic waste in poor nations to keep the environment cleaner for their citizens, regardless of what that waste will do to the people and environment of the receiving nation.

Perhaps most individuals would be appalled at the lengths their governments or random vigilantes will go to obtain their goals, but at a loss to suggest a system whereby everyone would come out a winner. In a dispute, both parties could equally benefit from it with harm done to no one. Our very nature makes it impossible to see how such a solution is probable. Surely, in any conflict, someone must back down, lose, or compromise?

Philosophers, thinkers, and great minds throughout the centuries have given much thought to the solution of this dilemma. Thousands of theories have been formulated for all mankind to, if not unite, then, at the very least, do each other no harm and still progress. But human judgment, while providing a temporary panacea, can be biased, self-centered, and quickly outdated. On the other hand, divine guidance is balanced, objective, and eternal. In the Holy Quran, God has described a system which is equally beneficial to all, and excludes no one. This guide eliminates the prevailing method whereby one party advances and progresses at the cost of the rest. In essence, it is a set of values and disciplines an individual or nation should follow to ensure not only your quality of life, but also improves the lives of those around you. Some of these Quranic principles are outlined below; the corresponding verses are noted.

1. Foremost of all the values is the respect for other human beings. All humanity is one nation (2:213) (10:19) God has made all human beings worthy of respect (17:70) says the Quran. At this human level, gender, nationality or even religion does not matter. You cannot abuse or harm others for who they are or their beliefs. Human life is extremely valuable. That is why Quran tells us that if you take one life without reason, it is like taking the life of the whole humanity and if you save one life, it is like saving the life of the whole humanity (5:32) and this is why suicide is also not allowed (4:29, 2:195).

2. The one and the only criterion for selecting one person over the other should be based on their actions (46:19). Whoever is more law abiding is that much more worthy of respect (49:13). Here it is important to mention that the "Law" should also be just.

3. Justice is another of the fundamental values. God has ordained us to be Just (16:90) even if we deal with nations that are our declared enemy (5:8). The same applies to individuals. You should not be unjust because you do not like any one for whatever reason.

4. In order to fulfill the needs of justice, it is the responsibility of the State that it ensures this. For this purpose the State machinery should be such that people who break laws should be brought to justice (2:179). However, the punishment should be proportional to the crime (10:27) and the law should be

flexible enough that people should be encouraged to correct themselves (42:40). When penalties are applied, one should be compassionate (74:6). Another important factor is that it is not enough to be just to others, you should also not allow others to be unjust to you (2:279).

5. No human being, regardless of his position, can enslave anyone else (3:79).
6. Everyone should be compensated according to what they do (53:39).
7. Knowingly, one should not hide the truth, when they know otherwise (2:43) nor should they confuse truth with falsehood (2:42) and to hide evidence (2:283).
8. One should not give evidence that is not true, even if it goes against oneself or one's parents or others close to the person (4:135).
9. Society should govern itself by mutual consent (42:38) and only those should be made rulers who are trustworthy. (4:158).
10. Wealth should be justly distributed amongst the people, as everyone has a right to it (7:10). It is the responsibility of the State to provide equal opportunity to all seekers (41:10). No one should be asked or forced to carry the burden that belongs to others (6:165).
11. People who have ability to earn more than their needs, should also think of others who are unable to (old, very young, sick, or disabled, etc.) and they should provide the needy from their surplus (2:219). However, this should be done without seeking any reward or expecting thanks (76:9).

In the end it should be noted that only those actions and deeds will endure in this world and meet the test of time, that are beneficial to the whole mankind (13:17).

Needless to say the list is not exhaustive but would give the reader an outline of the principles that will help to improve the Quality of all our Lives. These are my thoughts during this holy month of Ramadan when I see all the bloodshed and violence in neighboring countries and elsewhere in the world. Fasting during the holy month of Ramadan is a vital tool for such a purpose as we practice to tame our "self" so that we can adhere to the values and not transgress them.

May Allah give you the inner strength necessary to improve your life and life of others.

(For any comments, please feel free to contact the writer on his email address: uarain@gmail.com)

==========

Don't Worry, Be Happy

By

Aziz Mamuji

==========

'Don't Worry, Be happy.' Why is it that this common social refrain is apparently not relevant for today's clergy and pious practitioners of Islam? After all, Islam is a faith that offers spiritual fulfillment and worldly happiness. And happiness, we are repeatedly told, is like a ray of sunlight that warms and keeps us glowing - with a captivating charming smile adding that perfect compliment.

A radiant smile is a reflection of intrinsic happiness, and it projects the calm acceptance that one's status in life is essentially the outcome of one's best efforts. A smile in itself is an act of charity, and a person with a cheerful countenance is more likely to be perceived as being pleasant, attractive, sincere and sociable. Being happy is a God-given right and nobody can deny us this vital benevolence. This is the underlying objective of all religions, and a peaceful balanced society comprised of happy people, living freely by the morality and spiritual framework that their faith prescribes, is ultimately what everyone yearns for.

By frequently emphasizing happiness as a legitimate and achievable objective, Islamic thought accepts that spirituality, rationale and the material are collectively essential elements for achieving a blissful existence, provided it is lived decently.

Quite disconcertingly, however, our religious teachers and men of piety often depict a depressing demeanour. Their glum and grim aura is certainly not congruent with the deep contentment that they presumably accrue from their faith and beliefs. One expects that they understand Islam better than most and sincerely appreciate the joys of being good people, at whose disposal the Almighty's worldly blessings have been placed for honest and guiltless use. As spiritually uplifted and gratified wise men, they should really be drawing enormous pleasure from proudly spreading their message of peace and service to humanity. There is no reason for gloom to pervade their interaction with others, particularly those who look up to them for inspiration and guidance. Perhaps they are satisfied people, but sadly that is not the impression they give. Would we not be more reassured if we were to see an enthusiastic pep in their steps, and pukka smiles illuminating their kind faces?

The search for happiness is a philosophical and biological reality that cannot be suppressed. It is true that people can find happiness through various means, but our religion encompasses the wherewithal for individuals to discover self fulfillment, and for that ethos to extend throughout the community. Smiling is not

a sin; and we have neither been denied enjoyable entertainment, nor the pleasure of possessing nice things. A heavenly life on earth is as much a right as that which we seek in the hereafter, and we can blamelessly embrace every opportunity for rejoicing, provided it is derived respectably. Our Prophet (pbuh) too enjoyed laughing and joking with his companions. He never proclaimed having fun as being indecent and avoidable.

The Holy Quran tells us that attractive things of the world are not forbidden. Beautiful apparel and good food are not necessarily the symbols of decadent lifestyles. There is, as such, no justification for imposing restrictions on the basis of someone's personal interpretation of what is right or wrong. We strive for a life free of anxiety, without the pressure to adopt mores and norms that can lead to misery for the majority.

The clergy obviously have the power to influence our gullible youth and societies in general. Perhaps they would be more effective through friendly accessibility and openness, and by avoiding fiery rhetoric. In fact, this paradigm change in behaviour, when supplemented with a rational message, can eventually help create contented Muslim communities in which intellectual debate and basic freedoms prevail.

Self-improvement gurus emphasise the positive impacts of genuine smiling and the beneficial endorphins that are released; and psychologists expound on how personal contentment promotes inner health and longetivity. Common sense, however, tells us that happiness is not necessarily achieved by good luck, material indulgence, or financial and social power. An apt definition surmises that it is the feeling of fulfillment created when one's physical, emotional, intellectual and spiritual needs have been satisfied. Righteousness too is an effective elixir; and strong faith definitely lifts the spirit.

Rest assured that a warm and glowing smile will always be appreciated. By thinking positively, being helpful, doing what one loves, and enjoying life's permitted pleasures can all contribute to happiness; and, more importantly, to a friendly demeanour.

So its back to not worrying, and being happy. Keep smiling and have a Happy Ramadan!

Readers may wish to make references to the following Quranic verses that are relevant to this subject:

(Surrah/Verse) 2/1-5; 2/28; 2/200; 2/201; 3/14; 7/10; 7/31; 7/32; 10/103; 25/63; 30/6; 30/21; 30/47; 31/1-5; 36/55; 43/70; 48/29

==========

The Virgin Birth of Isa ibn-e-Maryam

By

Rashid Samnakay

Dear Uzmeenah and Abid- Salaams

I half expected that one day you will ask this question now that you are learning about ……I was going to say 'birds and bees' but I will be serious and say Human Biology! The approach of Christmas must have triggered your curiosity!

You see the myth of virgin births of deities predates even Christianity. For example Mithra the Iranian God of light, Aphrodite (Venus), Diana and the preposterous myth of virgin birth of Alexander the Great to make him look divine, are but a few legendary ones! So you can see where this belief has come from among Muslims.

In the Bible, the Gospels of Mathew and Luke refer to the Virgin Mary. For example in Luke chapter 1:34, 35 and ends up with a statement "because with God no declaration will be an impossibility, 1-37". This is the same as *kun fayakoon* in Qur'an.

The Christians believe that the Holy Spirit is supposed to be ethereal in Mary's conception thus making Jesus the 'Son of God', and Mary as the sole human parent in the process of his birth. Hence, Mary got elevated to being 'Mother of God' *nauzubillah*. Never the less The Bible mentions a human by the name of Joseph the carpenter, number of times as the father of Jesus Christ.

Dr Barbara Thiering, a theologian, and a scholar of the Gospels, has this to say in her book 'Jesus the Man', she says "Jesus was the leader of a radical faction of Essene (a group of high class) priests. He was not of virgin birth." There are many Christian theologians, scholars and even clergy who believe the same.

But as you have seen, majority of Muslims believe in the miraculous virgin birth of Isa ibn-e-Maryam. But close analyses of Qur'an paints a different picture. Let us first start with the Biblical assertion of the virgin birth and see how Qur'an refutes it: The following verses in Qur'an say;

25-2-"… no son has HE begotten, nor has HE a partner in HIS dominion" and

112-3-"HE begets not nor is HE begotten". There are many more such ayaat.

Clearly these emphasise the non-sharing of God's godliness on the bases of *laa ilaahaa*.

Secondly, The nineteenth Surah -Maryam tells the story of Isa ibn Maryam thus:

19-20- Maryam says to the angel (in man's shape) "How shall I have a son, seeing that no man has touched me, and I am not unchaste?" and

The answer?.. "So shall it will be…19-21" according to the fixed laws of God.

The story then continues that Maryam conceives and gives birth to a Son, suffering the "pains" every mother knows that is normally attached to child birth (19-23).

Historically speaking, as Maryam was from the higher religious and priestly class, they questioned her rebellion of having a child out side their self imposed religious and Temple customs (19-28). She points to her boy (*sabiyan*) who answers them- " I am indeed a servant of God. HE has given me a book (*kitab*) and made me a messenger"(19-30). A certain time span seems to have elapsed as the youth is now a messenger and has a Book to his name.

Briefly, to refute the myth of virgin birth, in the context of the above quoted verses concider this:

Maryam in 19-20 establishes the fact that she 'knew' that a child is always conceived in nature by the involvement of male and female of the species (Biology). Her statement that she is not 'unchaste' refutes the allegation that she broke any of the nature's or social moral rules, and the reply that 'so it will be', confirms God's laws which never change.

Verse 48-23 and others, stress the fact that God's laws are unchanging and that HE does not make exceptions --"(Such has been) the practice (approved) of God already in the past: no change will you find in the practice (approved) of God".

With reference to procreation there are quite a few verses that emphasise the involvement of male and female of the species. A few are given here for you to check:

30-30- "…(establish) God's handiwork according to the pattern on which HE has made mankind; No change (let there be) in the work (wrought) by God…"

35-11-"And God did create you from dust; then from a sperm-drop; then HE made you from pairs…" also51-49, 78-8, 42-11 etc.

But the best quotation of all, **one that refutes any claim for exemption** in the process of human creation is the oft read Surah Yaseen, which is ritualistically read at the death bed of a corps.--I will digress to recite to you a couplet of 'Azhar' our Yar Khan Chacha:

apno ki jazaa gar maqsood ho to khatm karaayaa jataa hun

martaa hai koee jab to gaa gaa kay sunaayaa jaataa hun. Back to Yaseen in Qura'n:

36-36- "Glory to God, Who created in pairs all things that the earth produces, **as well as their own (human) kind….**" Please note the underlined. Nothing could be more clearer than that. The human species is **not** exempt and that Isa ibn Maryam was, like all other messengers a human being. Therefore he must have had a human father.

Yet exemption is sought from within this same Surah, that Qur'an stresses the limitless capacity of God to do as HE pleases! " Indeed when HE intends a thing, HIS command is **Be and it is** (*kun fa yakoon*)36-82".

Of course HE can. Qur'an says so. HE created this universe, the heavens and the earth including every thing that is in between when there was nothing. But having created, not as a magician with a flick of the fingers, but over evolutionary time(7-54 etc), set up laws that are fixed. Time is one of the important dimensions in nature, see surah Dahar 76.

The other claim of theirs that Qur'an seeks to emphasise the 'virgin birth' by naming Isa as *Isa ibn Maryam* and not Isa bin Yusuf (the carpenter) could be simply argued from 19-23 where Maryam bemoans her fame of being from the high class dynasty -"would that I had been a thing forgotten and out of sight". She was far too famous to be ignored, for she had caused a revolution within the hierarchy of religious society, the church, and Joshep was a mere carpenter.

Apart from the fact that even now, the father is often known by the fame of the son as in *abu* so and so, the modern example of being known by other than the father, such as famous mother or wife is practiced eg. Prince Charles(who?) 'the son of Elizabeth II'!

'Asif Zardary, (who?)- the husband of Baynazir Bhutto', fits comfortably for Isa as the son and Yusuf the carpenter as Maryam's husband.(Prince Phillip was known in the Caribbean islands as, 'hoosbaaand belong Mrs. Queen'!)

All messengers without distinction were equal in God's scheme of things (3-84). No other messenger was given such exemption from the laws of nature. Then why would God single out Isa ibn-e-Maryam for 'special treatment'? Wouldn't that put a big dent in HIS credibility? We believe that God is not only credible but infallible too! Don't we? That is our Iman isn't it?

So why this drama of virgin birth, I here you ask? Simple! *Keh gulshan kaa kaarobaar chalay* That then leaves poor Joseph of the Bible the carpenter, a man, a father holding the baby for Maryam, so to speak!

==========